Regd.# MC-1366

دینی، اخلاقی اور معاشرتی اقدار کا علمبردار

جلد 15/ شمارہ 1/ اگست 2025

ماہنامہ

فہمِ دین

ہجرت

قلعہ سُرخ

پاکستان

حقیقی وفادار کے

سبز ہلالی پرچم

چراغ بنیں روشنی پھیلائیں

BAITUSSALAM PUBLICATIONS

91400056741

Baitussalam.org Baitussalam_org Baitussalam_org +9221-111-298-111

BAITUSSALAM TECH PARK

بیت السلام ٹیک پارک

BAITUSSALAM
—TECH PARK—

فری آئی ٹی کورسز

FREE IT COURSES

WHATSAPP: **+92 333 0189367**

EMAIL: **techpark@baitussalam.org** WEBSITE: **baitussalam.org/tech-park**

ماہ نامہ
فہمِ دین
کراچی

اگست 2025ء | صفر/ربیع الاوّل 1447ھ

زیرِ سرپرستی
حضرت مولانا عبدالستار حفظہ اللہ

مدیر: قارِی عبدالرحمٰن
نظرِ ثانی: طارق محمود
تزئین و آرائش: فیضان الحق شمسی

فہم و فکر

آئیے! چراغ بنیں روشنی پھیلائیں — مدیر کے قلم سے — 04

اصلاحی سلسلہ

فہم قرآن — شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم — 05
فہم حدیث — مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ — 06
آئینہ زندگی — حضرت مولانا عبدالستار حفظہ اللہ — 08

مضامین

اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگیں — حکیم شمیم احمد — 10
مسائل پوچھیے اور سیکھیے — مفتی محمد توحید — 11
سبز ہلالی پرچم — حفصہ محمد فیصل — 12
پاکستان بنا، یا آزاد ہوا؟ — عذرا خالد — 13
میں آزاد ہوں — انیلہ افضال ایڈوکیٹ — 15
یہ کیسی آزادی ہے؟ — امۃ الرحمن — 16
ماحولیاتی بحران اور اسلامی تعلیمات — حجاب سید — 17
آزادی پاکر بھی قیدی؟ — ندا اختر — 18

خواتینِ اسلام

بلاعنوان — ام محمد سلمان — 20
یومِ آزادی — انیسہ عائش — 22
سرخ قلعہ — شمائلہ شکیل — 24
خوف ناک مناظر — میمونہ عظیم — 25
غلطی — بنت مسعود احمد — 28
خالی برتن — تنزیلہ احمد — 29
ہجرت — آمنہ عبد الباسط — 32

باغچہ اطفال

درخت لگاؤ بخت جگاؤ — مہوش اسد شیخ — 34
بھیا اور 14 اگست — ڈاکٹر الماس روحی — 35
ننھا پاکستانی — مریم رضوان — 36
خواب سے حقیقت تک — ام محمد مصطفیٰ — 37
وطن کی گلیاں اور بچپن کا جشنِ آزادی — حفصہ سلطان — 38
کیا بنو گے؟ — دانیال حسن چغتائی — 39
آؤ بچو دیس نیا تعمیر کریں — خرم فاروق ضیا — 39

بزمِ ادب

شہیدوں پہ رحمت ہو تیری سدا — حافظہ وسطی چودھری — 42
تو ہے میرا اسکول تو ہے میرا جہاں — حافظہ سویرا چودھری — 43

اخبار السلام

اخبار السلام — ادارہ — 50

آراء و تجاویز کے لیے
+92 335 1135011

اشتہارات کے لیے
0314-2981344
marketing@fahmedeen.org

C-26 گراؤنڈ فلور، بن سیٹ کمرشل اسٹریٹ نمبر 2، خیابانِ جامی،
بالمقابل بیت السلام مسجد، ڈیفنس فیز 4 کراچی

ناشر: فیصل زبیر | مطبع: واسا پرنٹر | مقامِ اشاعت: دفتر فہم دین

آیئے! چراغ بنیں روشنی پھیلائیں

جمعے کی شب جو رمضان المبارک 1367ھ کی 27ویں رات تھی۔ دنیا کے نقشے پر ایک نئی ریاست کے قیام کا اعلان ہوا، جس کی بنیاد کلمہ طیبہ پر رکھی گئی تھی اور دو قومی نظریے کے تحت ہندوستان سے یہ خطہ الگ مملکت کے طور پر وجود میں آیا تھا، عرفِ عام میں قیامِ پاکستان کے اس روز کو یومِ آزادی سے یاد کیا جاتا ہے اور یہ روز 14 اگست کو بڑے جوش جذبے اور اہتمام سے منایا جاتا ہے۔ قیامِ پاکستان کے وقت عیسوی سن 1947ء تھا، اس طرح 2025ء کا 14 اگست 79 واں یومِ آزادی ٹھہرا۔

ایک وقت تھا، جب دینی حلقے جشنِ آزادی اور یومِ آزادی منانا صرف اسکول کالج اور دوسری دنیا کے لوگوں کا کام سمجھتے تھے بلکہ کئی حلقے یومِ آزادی منانے کو خرافات سے تعبیر کرتے تھے، اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ مملکت کے قیام کی اساس یعنی نفاذِ کلمہ طیبہ سے ہماری حکومتوں کا انحراف تھا، چناں چہ دینی حلقے مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں گرتے جارہے تھے۔ اللہ کا فضل ہوا، کچھ اہلِ دل حضرات نے یہ شعور پیدا کیا، انھوں نے پاکستان کی اہمیت کا سبق نئے سرے سے پڑھایا سمجھایا آزادی کا مفہوم اس کی قدر سے روشناس کرایا، چناں چہ اب دینی اداروں مذہبی جماعتوں میں یہ جذبہ ماشاءاللہ ایسا ہے کہ ماضی کی غفلت کا کفارہ ادا کر رہا ہے۔

دین سے دور حلقوں میں دو طرح کے لوگ چلے آرہے ہیں۔ ایک تو اس آزادی کو دوسرے ممالک کی آزادی کی طرح لیتے ہیں، خوب دھوم دھڑکا، شور شرابا، عیاشی اور بے راہ روی کا رُخ اختیار کیے ہوتے ہیں، جب کہ دوسرا طبقہ ایسا دھوم دھڑکا ایسا غل غپاڑہ تو نہیں مچاتا، لیکن اس کے ہاں بھی 14 اگست بس روایتی یومِ آزادی ہے۔ جھنڈا لگ جاتا ہے، چراغاں ہو جاتا ہے، محافل، مجالس کا نفرنسیں منعقد ہوتی ہیں، روایتی قسم کی تقریریں ہوتی ہیں، ملی نغمے پڑھے جاتے ہیں اللہ اللہ خیر سلّا! اس طرف توجہ کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی، نہ ہی ہمارے رہ نماؤں، حکم رانوں میں سے کوئی یہ سوچتا اور اس کا اظہار کرتا ہے کہ پاکستان کی بنیاد کس چیز پر رکھی گئی؟ قیامِ پاکستان کا پس منظر کیا تھا؟ دو قومی نظریہ سے کیا مراد ہے؟ اور اس کے کیا تقاضے ہیں۔۔۔؟

الحمدللہ! بڑی مدّت کے بعد قوم کو ایسا سپہ سالار ملا، جس نے دو قومی نظریے کا بھولا ہوا درس دہرایا۔ وہ کئی تقاریر میں کہہ چکے ہیں کہ نئی نسل کو یہ بتائیں کہ پاکستان کی تاریخ کیا ہے اور دو قومی نظریہ کیا ہے، پاکستان کے قیام کی بنیاد کیا تھی۔ ہمارا حکم ران طبقہ سپہ سالار فیلڈ مارشل کی تعریف کرتا، ان کی جرأت، جواں مردی اور سالاری کی تعریف کرتا ہے، اسے یہ بھی سوچنا چاہیے کہ سپہ سالار دو قومی نظریے کا بھولا سبق اگر یاد کروا رہے ہیں تو ان کے جملوں کو محض سننے اور تالیاں بجانے تک نہ رکھا جائے، اس جذبے اس نظریے کو اپنے دلوں میں اتارنے کی کوشش کریں اور سوچیں بحیثیتِ حکم ران اُن پر کیا ذمے داری عائد ہوتی ہے۔

پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ کا نعرہ آج بھی زندہ و تابندہ ہے، لیکن ابھی تک یہ نعرہ زبان پر ہی ہے، دل میں نہیں اترا، عمل میں نہیں آیا۔ اگر حکم ران اس نعرے کو خود پہ نافذ کر لیں تو انھیں قوم سے کہنا ہی نہیں پڑے گا، کوئی تقاضا نہیں کرنا پڑے گا، اس لیے کہ اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ لوگ اپنے رہ نماؤں بادشاہوں کی اتّباع کرتے اور ان جیسا بنتے ہیں۔ محتاط اندازے کے مطابق ایک چوتھائی آبادی تو ظاہری طور پر پہلے ہی اس کلمے پر عمل پیرا نظر آتی ہے، اگر حکم ران کلمہ طیبہ کے تقاضوں پر عمل شروع کر دیں تو کم از کم مزید پچاس فی صد لوگ طرزِ زندگی تبدیل کر لیں گے، باقی بچے گا ایک چوتھائی طبقہ! وہ چپ چاپ اپنی زندگی گزارنے کو غنیمت سمجھے گا، کسی ہلڑ بازی اور فتنہ فساد میں نہیں پڑے گا۔

کچھ عرصے سے ایک بات بڑی شدّت سے محسوس کی جارہی ہے کہ یومِ آزادی پر پہلے جیسا جوش جذبہ دیکھنے میں نہیں آرہا۔ دراصل ملک سے بیزار ایک تو وہ لوگ ہیں، جنھوں نے کبھی پاکستان کو دل سے قبول ہی نہیں کیا، ان کا مشن ہی سازشیں کرنا اور مایوسی پھیلانا ہے۔ دوسرا وہ طبقہ ہے جو مہنگائی، بدامنی، حکم رانوں کی اقربا پروری عدالتوں سے انصاف نہ ملنے کی وجہ سے مایوس ہو گیا ہے اور اس مایوسی میں وہ ملک سے ہی متنفر ہو گیا ہے۔ ہمارے دینی رہ نما، ائمہ مساجد تھوڑی سی محنت سے اس طبقے کی اصلاح کر سکتے ہیں، ایسے لوگوں کو مایوسی کے اندھیروں سے نکالنا ہو گا اور یہ باور کروانا ہو گا کہ اپنی ذات سے اصلاح کا کام شروع کریں، اپنے گھر کو ٹھیک کریں، یومِ آزادی پر آپ چراغاں بھلے نہ کریں، مگر خود چراغ ضرور بنیں۔ جوں جوں چراغ سے چراغ جلے گا، یہ روشنی اتنی پھیل جائے گی کہ ماحول تبدیل ہو گا، جب ملک کی واضح اکثریت اپنی ذات، اپنے گھر، اپنے خاندان، اپنی قوم اور اپنے قبیلے کا رُخ ٹھیک کر لے گی تو حکم رانوں پہ بھی کسی نہ کسی درجے میں یہ رنگ چڑھے گا اور ملک اپنی منزل کی طرف بڑھے گا ان شاءاللہ!!

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

فہمِ قرآن

الانعام 91-94

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ إِذْ قَالُوْا مَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ ؕ قُلْ مَنْ
أَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِىْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُورًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ
تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَآؤُكُمْ قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ
فِىْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ 91

ترجمہ: اور ان (کافر) لوگوں نے جب یہ کہا کہ اللہ نے کسی انسان پر کچھ نازل نہیں کیا تو انھوں نے اللہ کی صحیح قدر نہیں پہچانی۔ (ان سے) کہو کہ ”وہ کتاب کس نے نازل کی تھی جو موسیٰ لے کر آئے تھے، جو لوگوں کے لیے روشنی اور ہدایت تھی اور جس کو تم نے متفرق کاغذوں کی شکل میں رکھا ہوا ہے، جن (میں سے کچھ) کو تم ظاہر کرتے ہو اور بہت سے حصے چھپا لیتے ہو اور (جس کے ذریعے) تم کو ان باتوں کی تعلیم دی گئی تھی جو نہ تم جانتے تھے، نہ تمہارے باپ دادا؟ (اے پیغمبر! تم خود ہی اس سوال کے جواب میں) اتنا کہہ دو کہ وہ کتاب اللہ نے نازل کی تھی۔ پھر ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو کہ یہ اپنی بے ہودہ گفتگو میں مشغول رہ کر دل لگی کرتے رہیں۔“ 91

تشریح نمبر1: یہاں سے بعض یہودیوں کی تردید مقصود ہے۔ آنحضرت ﷺ کی مخالفت کرتے ہوئے ایک مرتبہ ان کے ایک سردار مالک بن صیف نے غصے میں آکر یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اللہ نے کسی انسان پر کچھ نازل نہیں کیا۔

تشریح نمبر2: یعنی پوری کتاب کو ظاہر کرنے کے بجائے تم نے اسے حصوں میں بانٹ رکھا ہے، جو حصے تمہارے مطلب کے مطابق ہوتے ہیں اُن کو تو عام لوگوں کے سامنے ظاہر کر دیتے ہو، مگر جو حصے تمہارے مفادات کے خلاف ہوتے ہیں، انھیں چھپا لیتے ہو۔

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ
الَّذِىْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى
وَمَنْ حَوْلَهَا وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ
يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ
يُحَافِظُوْنَ 92

ترجمہ: اور (اسی طرح) یہ بڑی برکت والی کتاب ہے جو ہم نے اتاری ہے، پچھلی آسمانی ہدایات کی تصدیق کرنے والی ہے، تاکہ تم اس کے ذریعے بستیوں کے مرکز (یعنی مکہ) اور اس کے ارد گرد کے لوگوں کو خبر دار کرو اور جو لوگ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، وہ اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور وہ اپنی نماز کی پوری پوری نگہداشت کرتے ہیں۔ 92

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ أُوْحِىَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ
إِلَيْهِ شَيْءٌ وَّ مَنْ قَالَ سَأُنْزِلُ مِثْلَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِي غَمَرٰتِ
الْمَوْتِ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ
الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ 93

ترجمہ: اور اُس شخص سے بڑا ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھے یا یہ کہے کہ مجھ پر وحی نازل کی گئی ہے، حالاں کہ اُس پر کوئی وحی نازل نہ کی گئی ہو اور اسی طرح وہ جو یہ کہے کہ میں بھی ویسا ہی کلام نازل کر دوں گا، جیسا اللہ نے نازل کیا ہے؟ اور اگر تم وہ وقت دیکھو (تو بڑا ہولناک منظر نظر آئے) جب ظالم لوگ موت کی سختیوں میں گرفتار ہوں گے اور فرشتے اپنے ہاتھ پھیلائے ہوئے، (کہہ رہے ہوں گے کہ) ”اپنی جانیں نکالو، آج تمہیں ذلت کا عذاب دیا جائے گا، اس لیے کہ تم جھوٹی باتیں اللہ کے ذمے لگاتے تھے اور اس لیے کہ تم اُس کی نشانیوں کے خلاف تکبر کا رویہ اختیار کرتے تھے۔“ 93

وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ
ظُهُوْرِكُمْ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا لَقَدْ تَّقَطَّعَ
بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ 94

ترجمہ: (پھر قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان سے کہے گا کہ) تم ہمارے پاس اسی طرح تن تنہا آ گئے ہو، جیسے ہم نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا تھا اور جو کچھ ہم نے تمہیں بخشا تھا وہ سب اپنے پیچھے چھوڑ آئے ہو اور ہمیں تو تمہارے وہ سفارشی کہیں نظر نہیں آ رہے، جن کے بارے میں تمہارا دعویٰ تھا کہ وہ تمہارے معاملات طے کرنے میں (ہمارے ساتھ) شریک ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے ساتھ تمہارے سارے تعلقات ٹوٹ چکے ہیں اور جن (دیوتاؤں) کے بارے میں تمہیں بڑا زعم تھا، وہ سب تم سے گم ہو کر رہ گئے ہیں۔ 94

فہمِ حدیث

رسول اللہ ﷺ کس طرح نماز پڑھتے تھے؟

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَسْتَفْتِحُ الصَّلٰوةَ بِالتَّكْبِيْرِ وَالْقِرَأَةَ بِالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَكَانَ إِذَا رَكَعَ لَمْ يُشْخِصْ رَأْسَهُ وَلَمْ يُصَوِّبْهُ وَلٰكِنْ بَيْنَ ذٰلِكَ وَكَانَ إِذَا رَفَعَ رَاسَهُ مِنَ الرُّكُوْعِ لَمْ يَسْجُدْ حَتّٰى يَسْتَوِيَ قَائِمًا وَكَانَ إِذَا رَفَعَ رَاسَهُ مِنَ السَّجْدَةِ لَمْ يَسْجُدْ حَتّٰى يَسْتَوِيَ جَالِسًا وَكَانَ يَقُوْلُ فِي كُلِّ رَكْعَتَيْنِ التَّحِيَّةَ وَكَانَ يَفْتَرِشُ رِجْلَهُ الْيُسْرٰى وَيَنْصِبُ رِجْلَهُ الْيُمْنٰى وَكَانَ يَنْهٰى عَنْ عُقْبَةِ الشَّيْطَانِ وَيَنْهٰى أَنْ يَّفْتَرِشَ الرَّجُلُ ذِرَاعَيْهِ اِفْتِرَاشَ السَّبُعِ وَكَانَ يَخْتِمُ الصَّلٰوةَ بِالتَّسْلِيْمِ (رواہ مسلم)

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ تکبیر تحریمہ سے نماز شروع فرماتے تھے اور قرات کا آغاز "الحمد للہ رب العالمین" سے کرتے تھے اور جب آپ رکوع میں جاتے تو سر مبارک کو نہ تو اوپر کی جانب اُٹھاتے اور نہ نیچے کی جانب جھکاتے، بلکہ درمیانی حالت میں رکھتے تھے (یعنی بالکل کمر کے متوازی) اور جب رکوع سے سر مبارک اُٹھاتے تو سجدہ میں اُس وقت تک نہ جاتے جب تک کہ سیدھے کھڑے نہ ہو جاتے اور جب سجدے سے سر مبارک اُٹھاتے تو جب تک بالکل سیدھے نہ بیٹھ جاتے دوسرا سجدہ نہیں فرماتے اور ہر دو رکعت پر التحیات پڑھتے تھے اور اُس وقت اپنے بائیں پاؤں کو نیچے بچھا لیتے اور داہنے پاؤں کو کھڑا کر لیتے تھے اور عُقْبَةُ الشَّيْطَانِ (یعنی شیطان کی طرح بیٹھنے سے منع فرماتے تھے اور اس بات سے بھی منع فرماتے تھے کہ آدمی (سجدہ میں) اپنی باہیں (یعنی کلائیاں کہنیوں تک) زمین پر رکھے، جس طرح کہ درندے اپنی کلائیاں زمین پر بچھا کے بیٹھتے ہیں اور آپ "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" کہہ کے نماز ختم فرماتے تھے۔ (صحیح مسلم)

تشریح: نماز، عبادت بلکہ اعلیٰ درجہ کی عبادت ہے۔ اس لیے اس کے لیے قیام، قعود، رکوع و سجود کی وہ شکلیں اور ہیئتیں مقرر کی گئی ہیں جو عبادت اور بندگی کی بہترین اور مکمل ترین تصویر ہیں اور اُن نامناسب ہیئتوں سے خصوصیت کے ساتھ منع فرمایا گیا ہے، جن میں استکبار یا بے پروائی یا بد نظری کی شان ہو یا کسی بد فطرت مخلوق کی ہیئت سے مشابہت ہو۔

اس اصول کے تحت رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے کہ سجدے میں آدمی کلائیاں زمین پر اس طرح بچھا دے، جس طرح کتے اور بھیڑیئے وغیرہ درندے بچھا کر بیٹھتے ہیں اور اسی اصول کے تحت آپ نے اس طرح بیٹھنے سے بھی منع فرمایا جس کو اس حدیث میں عُقْبَةُ الشَّيْطَانِ اور ایک دوسری حدیث میں "اقعاء الکلب" فرمایا گیا ہے۔

خاص اذکار اور دعائیں

رسول اللہ ﷺ نماز کے مختلف اجزا یعنی قیام اور رکوع و سجود وغیرہ میں جن کلمات کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس لیں اور حمد و ثنا کرتے تھے اور اس سے جو دُعائیں اور التجائیں کرتے تھے، ان اذکار و دعوات سے دل کی جس کیفیت کی ترجمانی ہوتی ہے، وہی دراصل نماز کی حقیقت اور روح ہے۔ اس نقطۂ نظر سے ان حدیثوں کو پڑھیے اور ان کیفیات کو اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کیجیے، یہی دولتِ عظمیٰ رسول اللہ ﷺ کا خاص الخاص ورثہ ہے۔

أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَسْكُتُ بَيْنَ التَّكْبِيْرِ وَبَيْنَ الْقِرَأَةِ إِسْكَاتَةً فَقُلْتُ بِأَبِيْ أَنْتَ وَأُمِّيْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِسْكَاتَكَ بَيْنَ التَّكْبِيْرِ وَبَيْنَ الْقِرَأَةِ مَا تَقُوْلُ؟ قَالَ أَقُوْلُ اللّٰهُمَّ بَاعِدْ بَيْنِيْ وَبَيْنَ خَطَايَايَ كَمَا بَاعَدْتَ بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ اللّٰهُمَّ نَقِّنِيْ مِنَ الْخَطَايَا كَمَا يُنَقَّى الثَّوْبُ الْأَبْيَضُ مِنَ الدَّنَسِ اللّٰهُمَّ اغْسِلْ خَطَايَايَ بِالْمَاءِ وَالثَّلْجِ وَالْبَرْدِ (رواہ البخاری و مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ تکبیرِ تحریمہ اور قرات کے درمیان کچھ دیر سکوت فرماتے تھے (یعنی آواز سے کچھ نہیں پڑھتے تھے، لیکن محسوس ہوتا تھا کہ آپ خاموشی سے کچھ پڑھتے ہیں) تو میں نے ایک دفعہ عرض کیا یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان! مجھے بتا دیجیے کہ تکبیرِ تحریمہ اور قرقرات کے درمیان کی خاموشی میں آپ کیا پڑھتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں اللہ سے دُعا کرتا ہوں اللّٰهُمَّ بَاعِدْ۔۔۔ الخ کہ اے اللہ! میرے اور میری خطاؤں کے درمیان اتنا طویل فاصلہ کر دے جتنا طویل فاصلہ تو نے مشرق و مغرب کے درمیان کر دیا ہے اور اے اللہ! مجھے خطاؤں سے ایسا پاک و صاف کر دے جیسا کہ سفید کپڑا میل کچیل سے پاک صاف کر دیا جاتا ہے اور اے اللہ! میری خطاؤں کو پانی سے اور برف سے اور اولے سے دھو ڈال۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

تشریح: رسول اللہ ﷺ اگرچہ عام معاصی اور منکرات سے معصوم اور محفوظ تھے، لیکن "قربیاں را بیش بود حیرانی" کے فطری اصول پر آپ ان لغزشوں سے سخت لرزاں و ترساں رہتے تھے جو بربنائے بشریت آپ سے سرزد ہو سکتی تھیں اور معصیت نہ ہونے کے باوجود آپ کی شانِ عالی اور مقامِ قرب کے لحاظ سے قابلِ گرفت ہو سکتی تھیں۔

Shangrila®

THE FOOD EXPERTS!

Signature Sauces

MADE WITH
LOVE
CROWNED BY THE
NATION

PAKISTAN'S
NO.
*SAUCES

EVERY POUR TELLS A
Different Story

*Foresight Household Panel 2024

www.shangrila.com.pk | ShangrilaPakistan | ShangrilaPakistan

پاکستان حقیقی وفادار کے

حضرت مولانا عبدالستار حفظہ اللہ

پاکستان پاک زمین کا نام ہے۔ ہمارے بزرگوں نے اس کو مسجد سے تشبیہ دی ہے، یعنی اس کا تقدّس، اس کی حفاظت ایسی جیسے مسجد کی ہے۔ لاکھوں مسلمانوں نے اس کے لیے قربانی دی ہے، پھر یہ خطۂ زمین آزاد ہوا اور مسلمانوں کو جب کوئی آزادی ملتی ہے، وہ محض ایک خطے کی آزادی نہیں ہوتی، ان کے پیشِ نظر ایک عظیم مقصد ہوتا ہے، جس کے لیے مسلمان قربانی دیتا ہے۔ اتنی بڑی قربانی جو مسلمانوں نے دی ہے، مسلمانوں سے وعدہ کیا گیا تھا کہ یہ خطہ اس لیے لیا جارہا ہے کہ یہاں قرآن کا نظام ہوگا، چناں چہ بچے بچے کی زبان پر تھا "پاکستان کا مطلب کیا؟ لاالہ الااللہ" "ہم لے کے رہیں گے پاکستان، بٹ کے رہے گا ہندوستان" اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ یہ محنت قربانی اور کوشش چند سالوں کی نہیں، بلکہ 1857 کی جنگِ آزادی سے لے کر صبر آزما حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے پھر مسلمان اس منزل پر پہنچے کہ 1947 میں انھیں ایک آزاد خطہ ملا۔

نئی نسل کو تو پتا ہی کوئی نہیں کہ اس ملک کی تعمیر اور قیام میں علمائے کرام اور عام مسلمانوں کا کتنا بڑا کردار ہے، انھیں یہ بھی پتا ہی نہیں کہ مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلادیش میں) شیخ الاسلام علّامہ ظفر احمد عثمانیؒ نے جھنڈا لہرایا تھا۔ مغربی پاکستان میں پاک پرچم علّامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے لہرایا۔

تحریکِ آزادی میں ان اکابر کا کردار بہت تھا، عوام کا ان پر بے پناہ اعتماد تھا، 1946 کے ریفرنڈم میں علمائے کرام نے عوام کی رائے ہم وار کی اور انھیں اس پر آمادہ کیا کہ ایک آزاد خطہ حاصل کرنے کے لیے کوشش کی جائے۔ وعدہ وہی تھا کہ یہاں اسلام اور قرآن کی زندگی اور اس کا نفاذ ہوگا۔

اللہ رب العزت نے یہ خطہ بھی ایسا غیر معمولی بنایا ہے کہ دنیا میں اس کی مثال نہیں ملتی، کون سا خزانہ ہے جو یہاں نہیں ہے، زمین خزانوں سے بھری پڑی ہے۔ زرخیز ملک ہے، چار موسم ہیں، انڈونیشیا کے بعد جب بنگلادیش بننے سے پہلے پاکستان ساتھ تھا تو سب سے بڑی اکثریت تھی مسلمانوں کی اور اتنی بڑی نوجوانوں کی طاقت، لیکن سوچنے کی بات ہے وہ کیا چیز ہے کہ اس قوم کو اس آزادی کی برکات اور ثمرات نصیب نہیں ہوئے۔

سچی بات ہے کہ ہمیں اللہ نے یہ ملک دیا، ہم نے قدر نہیں کی۔۔۔ اپنے ملک میں اسلامی قوانین کو تحفظ نہیں دیا، اسے عزت نہیں دی، ایک حصہ جاچکا ہے اور ابھی بھی ہم مختلف بحرانوں میں گھرے ہوئے ہیں، ہم تو ہر وقت ہر نماز میں دعا کرتے ہیں، اللہ اس ملک کا حامی و ناصر ہو، اس لیے کہ یہ ملک ہماری پہچان ہے، یہ ملک ہماری عزّت ہے، یہ ہے تو یہاں دین کے سارے شعبے ہیں، لیکن مِن حیثُ القوم جو ہم نے اس نعمت کی ناقدری کی تو نقشہ اچھا نہیں ہے، نفرتیں بہت ہوگئی ہیں، جب اسلام کے نظام کے مطابق نہ عدالتی نظام ہوگا، نہ اس کے احکام کا نفاذ ہوگا تو ناانصافیاں ہوں گی، ظلم ہوگا اور جب ظلم اور ناانصافی ہوگی تو پھر عصبیت اور لسانیت کو راستہ ملے گا۔ اب تو محض ذاتی مفادات کے لیے جماعتی مفاد کے لیے اپنے گروپ کے مفاد کے لیے نفرتوں کی آگ لگائی جاتی ہے، یہ سوچے بغیر کہ اس ملک کا پھر کیا ہوگا؟ اس ملک کا پھر تحفظ کیسے ہوگا؟ یہ ملک کیسے استحکام سے رہے گا؟ صرف ذاتی مفادات کے لیے جماعتی مفاد کے لیے قوم میں آگ لگائی جاتی ہے اور چوں کہ قوم خود انفرادی سطح پر اپنی دینی زندگی سے دور ہوتے چلی جارہی ہے تو سب سے پہلے اللہ نے جو چیز دی ہے، وہ شعور لیا ہے، وہ عقل لی ہے، وہ سمجھ بوجھ لی ہے تو نتیجہ یہ ہے کہ ان بے دین قیادتوں کو پچھتّر سال سے آزمارہے ہیں، ان کے پیچھے لگے ہیں، یہ تو وہ ملک ہی نہ رہا جو قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ کی قیادت میں حاصل کیا گیا تھا، وہ تصور ہی نہ رہا جو علّامہ اقبال نے دیا تھا، جس مقصد کے لیے مسلمانوں نے اتنی بڑی قربانی دی تھی، وہ تو حاصل ہی نہیں ہوسکا۔

امتِ مسلمہ کا بہت بڑا المیہ ہے کہ آج اسلامی دنیا میں جو قیادتیں ہیں، وہ اسلام بے زار ہیں، دین بے زار ہیں، یہ المیہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنی انفرادی زندگی میں بھی اسلام کی بالادستی قبول نہیں کی، اس کو تحفّظ نہیں دیا، گھر میں بچوں کی تربیت میں اپنی غمی خوشی میں، اپنی دکان میں، اپنے کاروبار میں، جو میرا دائرہ کار تھا، جہاں اللہ نے مجھے اختیار دیا تھا، میں نے وہاں اسلام کو کتنا تحفظ دیا تو جب یہ تحفّظ نہیں ملا تو اللہ حفاظت فرمائے جو اللہ نے اتنا پیارا ملک دیا تھا، اتنا پیارا وطن دیا تھا، اب یہاں ہر آدمی ان جانے سے خوف کا شکار ہے، کل کیا ہوگا؟ ہم نے یہ محسوس کیا ہے کہ پہلے چودہ اگست میں جوش و خروش ہوا کرتا تھا، وہ ہمیں نظر نہیں آرہا، ایک مایوسی سی ہے، ہر آدمی اپنے دائرہ میں پریشانی میں مبتلا ہے۔

قرآن آئینہ ہے کہ کہیں امن ہو اور اطمینان ہو، لیکن جب نعمتوں کی ناشکری ہوتی ہے، اللہ

امن اٹھالیتا ہے، اللہ امن ختم کر دیتا ہے، اللہ رب العزت سکون ختم کر دیتا ہے، اللہ رب العزت رزق کی فراوانی اور خوش حالی ختم کر دیتے ہیں۔ اللہ انھیں خوف کا اور بھوک کا لباس پہنا دیتے ہیں، ہر وقت معاشی پریشانی رہتی ہے اور آنے والے حالات کے بارے میں ہمیشہ ایک خوف رہتا ہے، پتا نہیں کیا ہوگا؟ ہمارے ملک میں اب بالکل یہی صورت حال ہے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین فرمایا کرتے تھے: ہمیں تو عزّت ملی ہے اسلام کی بدولت، ہم تو گرے پڑے لوگ تھے، اللہ نے ہمیں سنبھال لیا، ہم نے اسلام کو عزّت دی اللہ نے ہمیں عزت دے دی، ہم نے اسلام کا خیال رکھا اللہ نے ہمارا خیال رکھا، لیکن اب تو ذہنیت اتنی بدل چکی ہے، بیماری اتنی بڑھ چکی ہے، اب تو سمجھتے ہیں کہ اگر اسلام پر قومی سطح پر عمل ہوا تو شاید ہم ترقی میں پیچھے چلے جائیں گے، شاید ہم پھر پستی کی طرف چلے جائیں گے، شاید ہم پھر رسوا ہو جائیں گے، جیسے پچھتر سال سے ہمیں بڑی عزّت ملی ہے، پھر رسوا ہو جائیں گے، اللہ کا دیا ہوا یہ دین رسوا کرنے کے لیے نہیں آیا عزّت دینے کے لیے آیا ہے، مشکلات میں ڈالنے کے لیے نہیں آیا مشکلات سے نکالنے کے لیے آیا ہے، ناکامی کے لیے نہیں آیا کامیاب کرنے کے لیے آیا ہے، لیکن ایسی ذہنیت خراب ہو گئی، ایسی یہ بیماری بڑھ گئی، ایسی فکر خراب ہوئی کہ آج اسلامی زندگی پر اعتماد ہی ختم ہو گیا ہے، حالاں کہ آنکھوں کے سامنے ہے، انصاف کے دائرے میں انصاف کی جگہوں پر جب قرآن کا نظام نہیں ہے تو آج کسی کو انصاف نہیں ملے گا، بلکہ انصاف کا تصور ہی مشکل ہو گیا ہے، جس کی لاٹھی اسی کی بھینس ہے، یہاں تو جنگل کا قانون ہے۔

آج بتائیے! قومیت، عصبیت اور لسانیت کا نعرہ کون لگاتا ہے؟ مسجد والا، قرآن والا، حدیث والا نبی کی زندگی والا کہیں نہیں ملے گا، اس کی برکت سے تو یہ فتنے دبے ہوئے ہیں، کبھی نہیں سنا ہوگا کسی دینی ادارے کے اندر زبان کی بنیاد پر جھگڑا ہوا ہو، ہاں! کالج میں سنا ہوگا، یونیورسٹیوں میں سنا ہوگا، اسکولوں میں سنا ہوگا، دفتروں میں سنا ہوگا، پارلیمنٹ میں سنا ہوگا، قومی اداروں میں سنا ہوگا، آپ نے دینی اداروں میں نہیں سنا ہوگا کہ وہاں پنجابی اور پٹھان لڑے زبان کی بنیاد پر۔۔۔ مہاجر اور سندھی لڑے، اس لیے کہ جہاں اسلام ہے، وہاں تو مسلمان ہے، وہاں تو اسلامی اخوت ہے، وہاں تو اسلامی بھائی چارہ ہے۔ ایک مسجد کے اندر ایک ہی صف میں کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہیں، کون ہیں؟ یہ زبان مختلف، علاقہ مختلف، قوم مختلف، صوبے مختلف، لیکن سبحان اللہ! محبت موجود ہے، اخوت موجود ہے، اگر اسلام نہ رہا اس ملک میں، اس ملک کا وجود خطرے میں ہے اور یاد رکھیے! جو اس ملک میں اسلام دشمن ہیں، وہ حقیقت میں اس ملک کے قیام کے دشمن ہیں، اس ملک کے وجود کے دشمن ہیں، وہ اس ملک کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہیں، چاہے وہ کسی بھی روپ میں ہوں، چاہے وہ کیسے بہروپیہ بن کر آپ کے سامنے آئے ہوں، جسم کے اندر سے روح باقی نہ رہے تو بتائیے کہ جسم اپنا وجود باقی رکھ سکتا ہے؟ کچھ عرصے کے بعد ہاتھ الگ ہو جائیں گے، ٹانگیں الگ ہو جائیں گی، آنکھ الگ ہو جائیں گی، جسم کے حصے بکھر جائیں گے، ایک روح ہے جس نے اس جسم کا وجود باقی رکھا ہوا ہے۔ وطنِ عزیز اس پیارے ملک کی شکل میں جو نعمت دی ہے، اس کی بقا، اس کا استحکام اسلام کی روح کی تازگی کے ساتھ ہے، جتنا اسلام تازہ ہوگا، اتنا ہی یہ عصبیت لسانیت کے جتنے بت ہیں یہ سب پاش پاش ہو جائیں گے، یہ سب ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔

ہم اپنے دائرۂ کار میں اسلام کی زندگی کو تحفّظ دیں، اگر ہم نے یہ کر لیا تو ان شاء اللہ یہ ملک ہمیشہ باقی رہے گا، اگر ہم نے یہ اسلام کی امانت نسلوں تک منتقل کر دی، یہ ملک بھی باقی رہے گا اور یہی اسلام ہے جو اس ملک کی حقیقی زندگی ہے، جس کے لیے مسلمان اپنی جان لگا دینا اس ملک کی خاطر اپنا اعزاز سمجھتا ہے، اپنی سعادت سمجھتا ہے، لیکن اگر یہ محض زمین کا خطہ رہ گیا، اسلام کا وجود یہاں سے اس کو تحفظ نہ ملا تو پھر گویا ملک کی بنیاد صرف مادّیت ہو جائے گی تو آپ نے دیکھا ایسی مادّیت پرست تو اس ملک کو چھوڑ کر ویسے ہی چلے جاتے ہیں، وہ یہاں رہنا ہی نہیں چاہتے، ان کے بچے یہاں رہنا نہیں چاہتے، یہاں سے کماتے ہیں، یہاں سے لوٹتے ہیں نا۔۔۔ ان کی اولادیں رہنا چاہتی ہیں نا۔۔۔ ان کے ریٹائرڈ ہونے کے بعد وہ خود رہنا چاہتے ہیں۔

اس ملک کے حقیقی وفادار وہی ہیں، جو سچ میں اسلام کے وفادار اور وارث ہیں۔ اس مٹی کے حقیقی وارث اور سچے وفادار تو وہی ہیں جو اسلام کے وفادار اور اسلام کے جسے کہیں کے محافظ ہیں۔ وہ اس زمین کے لیے، اس خطے کے لیے، اس ملک کے لیے، اپنی جان کا نذرانہ دینا اپنے لیے اعزاز سمجھتے ہیں، سعادت سمجھتے ہیں۔

بحرانوں اور خطرات نے ہمارے وطن کو گھیر رکھا ہے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ قوم متحد ہو اور یہ اتحاد ایمان کی بنیاد پر اسلام کی بنیاد پر ہو، کلمہ کی بنیاد پر ہو اور اس ملک کی حفاظت اور استحکام کی خاطر کوئی ایسا منفی طرزِ عمل نہ ہو جو اس ملک کی اتحاد اور اس کے استحکام میں خطرہ بنتا ہو اور خود بھی اور اپنے ماحول کے اندر بھی اسلام کو تحفّظ دیں، اسلام کی زندگی کو تحفّظ دیں۔ اللہ کرے ہمیں اس بات پر اعتماد آجائے کہ اسلام ہی میں اس ملک کی بقا ہے اور اسلام میں ہماری عزّت اور ہمارا تحفّظ ہے، طرح طرح کی مشکلات ہیں اور لوگ مختلف انداز سے ان مشکلات کا تذکرہ بھی کرتے ہیں، لیکن بد قسمتی ہے!! کسی کی زبان اور دل پر یہ بات نہیں آتی کہ ہماری ساری مشکلات کا حل شریعت ہے، دین ہے۔ اب کوئی کہتا ہے میثاقِ جمہوریت ہونا چاہیے، کوئی کہتا ہے میثاقِ معیشت ہونا چاہیے، پتا نہیں میثاقِ شریعت پر کب آئیں گے؟ اس پر کب اکٹھے ہوں گے۔۔۔؟

اور انھیں یہ بھی خوف ہے کہ اگر شریعت پر آگئے تو پتا نہیں کیا ہوگا؟ اور دوسرا چوں کہ اندر سے بزدل ہیں، ایمان کی کم زوری ہے، باطل کا بھی ڈر ہے، خوف موجود ہے تو اب تو یہ بات مجمعوں سے بھی غائب ہو گئی، قومی اداروں سے بھی غائب ہو گئی، قومی دنوں سے بھی غائب ہو گئی کہ اس ملک کی قسمت اسلام کے ساتھ ہے، ایمانی اور دینی زندگی کے ساتھ ہے۔ یاد رکھیے! مسلمان وطن پرست نہیں ہوتا، وہ وطن دوست ہوتا ہے۔ مسلمان کبھی اپنے ملک کا غدار نہیں ہوتا، ملک دشمن نہیں ہوتا، ملک دوست ہوتا ہے اور یہ اس کے اسلام کا اور اس کے ایمان کا تقاضا ہے، پرستش اللہ کی، پہلا حکم اللہ کا، لیکن وہ اپنے ملک سے دوستی رکھتا ہے، وفاداری کرتا ہے، تحفّظ کرتا ہے، اس لیے کہ وہ ملک اس کے لیے ماں کی طرح ہے تو اللہ نے یہ ملک عطا فرمایا ہے۔ ہم نے اس کے لیے اپنی صلاحیتیں، اپنی استعداد کے لحاظ سے اپنے وسائل کے لحاظ سے اپنے دائرۂ کار کے لحاظ سے اس کے استحکام کی جدّوجُہد ہمیشہ جاری رکھنی ہے اور ہمیشہ اس ملک کی بقا اور حفاظت کے لیے محنت کرنی ہے اور پھر اس ملک کی حفاظت اور بقا کے لیے بھی اپنی دعاؤں میں بھی ایک حصہ رکھیں۔ اللہ تعالیٰ اس ملک کا ہمیشہ حامی و ناصر ہو!!

اللہ سے عافیت مانگو

حکیم شمیم احمد

تمام حمد و ثنا اللہ کے لیے ہے۔ اُس کی پناہ میں جو آجائے اُس کو وہ پناہ دیتا ہے اور جو اُس پر توکل کرے اُس کے لیے کافی ہوتا ہے، جو اُس سے دعا کرے اُس کی دعا قبول کرتا ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اُس کے سوا کوئی معبودِ حقیقی نہیں۔ وہ اکیلا ہے اُس کا کوئی شریک نہیں۔ ہمارے سردار نبی آخر الزماں ﷺ اُس کے بندے اور رسول ہیں۔ اُس کے خلیل اور چنیدہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ حضور ﷺ پر اور اُن کے آل و اصحاب پر اپنی رحمتیں اور برکتیں نازل فرمائے، جنھوں نے آپ ﷺ کا قدم قدم پر ساتھ دیا۔ تبع تابعین پر رحمتیں نازل فرمائے انھوں نے آپ ﷺ کی پیروی کی۔

مسلمانو! ایک عظیم چیز جو ایمان کے بعد سب سے بڑا عطیہ ہے اور سب سے بڑھ کر پسندیدہ چیز ہے۔ دنیا و آخرت صرف اُسی سے بن سکتی ہے۔ اِس کی بدولت زندگی خوش گوار ہو سکتی ہے، وہ نیک بختی اور اُنسیت ہے۔ تندرست لوگوں کے سر کا تاج ہے۔ معزز مقصد ہے، جسے بندہ اپنے رب سے نیند اور بیداری میں عافیت طلب کرتا ہے۔ اُس کو نمازوں میں اپنی خلوتوں اور جلوتوں میں اپنے رب سے مانگتا ہے، جس کی بدولت وہ کھاتا ہے، چلتا ہے، سوتا ہے، سوچتا ہے اور عمل کرتا ہے۔ خوش و خرم رہتا ہے۔ سب سے بڑا سرمایہ اور سب سے بڑی ثروت ہے، اللہ کے بندوں وہ عافیت ہے۔ عافیت ایسی چیز ہے جس کی ضرورت ہر آزمائش والے ہر مصیبت زدہ زندہ و مردہ سب کو ہے۔ عافیت کھو جائے تب پہچانی جاتی ہے، جب وہ رہتی ہے تو بھلا دی جاتی ہے، سوا اپنے رب سے عافیت مانگو۔

اے اللہ ہم تجھ سے دنیا و آخرت میں دائمی معافات کا سوال کرتے ہیں۔

حضرت عباس ابنِ مطلب رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور کہا کہ مجھے کوئی ایسی چیز سکھا دیں کہ میں اپنے رب سے مانگوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اللہ سے عافیت مانگو۔“ کچھ دن ٹھہرنے کے بعد آپ پھر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ”اے اللہ کے رسول ﷺ! مجھے کچھ سکھا دیں کہ میں اللہ سے مانگوں۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اے عباس، اے رسول اللہ ﷺ کے چچا! آپ دنیا و آخرت میں عافیت مانگیں۔“ اُس کو مسندِ احمد، ترمذی اور البانی نے صحیح کہا ہے۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ منبر پر کھڑے ہوئے اور رونے لگے، پھر مخاطب ہو کر کہا: ”رسول اللہ ﷺ پہلے سال منبر پر کھڑے ہوئے، پھر رونے لگے اور آپ ﷺ نے فرمایا اللہ سے عفو اور عافیت طلب کرو، کیوں کہ کسی کو بھی ایمان کے بعد عافیت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں دی گئی۔“ (اس کو امام احمد، بخاری اور عدیم الفرد۔ نسائی، ابن حبا اور البانی نے صحیح کہا ہے، اس کی سند قوی ہے) اہلِ علم نے کہا کہ عافیت کی دعا کرنا نبی کریم ﷺ سے تواتر سے ثابت ہے۔ لفظی اور معنوی طور پر تقریباً پچاس طرق پر وارد ہے۔ یہ دعا نقصان سے دفاع کرنے، سکون اور راحت کو طلب کرنے کا ہتھیار ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ ”اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ شبِ قدر کس رات میں ہے تو میں عافیت ہی طلب کروں گی۔“ ایک اور روایت میں ہے کہ میں شبِ قدر میں اِس دعا کا بھی اہتمام کروں گی

اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّیْ

ترجمہ: اے اللہ تو معاف کرنے والا ہے، معافی کو پسند کرتا ہے، پس مجھے معاف کر دے۔

عافیت کسے کہتے ہیں؟ فقیہہ ابو اللیثؒ فرماتے ہیں کہ اللہ بندے کا دفاع کرے، جب اُس کو کوئی مصیبت لاحق ہو، چناں چہ اللہ اپنے بندوں سے اُس مصیبت کو ٹال دیتا ہے۔ عافیت کا سوال کرنا ایک جامع دعا ہے، آخرت کی ہو لنا کیوں سے بندے کی حفاظت کرتی ہے۔

عافیت کی تین قسمیں ہیں: عفو، عافیت اور معافات۔ عفو ماضی کا شر دور کرتا ہے، موجودہ شر عافیت سے دور ہوتا ہے اور مستقبل کا شر معافات سے دور ہوتا ہے۔ امام ابنِ قیمؒ کہتے ہیں کہ ساری چیزیں عافیت کی پائیداری اور بقا کے لیے ہیں۔

عافیت دو طرح کی ہوتی ہے: ایک دین کی عافیت اور دوسری بدن کی عافیت۔ اگر یہ دونوں اکٹھی ہو جائیں تو یہ اللہ کا بڑا اکرم اور احسان ہے۔ حقیقتاً یہ بندے کی دینی و دنیاوی سلامتی ہے۔ مسلمان حق پر ثابت قدم رہنے، باطل اور اہلِ باطل سے دور رہنے کفر، گم راہی، نفاق، فسق و فجور اور گناہوں سے دور رہنے، شہوات اور شبہات، بدعت، ظاہر و باطن کے فتنوں سے محفوظ رہنے میں ہی دین میں عافیت حاصل ہو گی۔

آخرت میں عافیت ہی ہو لنا کیوں سے بچا سکتی ہے۔ موت اور موت کی سختی، قبر کی آزمائشوں سے، حشر کے دن اللہ کے حضور پیشی سے، اُس دن کی گھبراہٹ سے عافیت سے ہی نجات ملے گی۔

بقیہ صفحہ نمبر 12 پر

مسائل پوچھیں اور سیکھیں

مفتی محمد توحید

فارایور کمپنی میں کام کرنا

خلاصۂ سوال: میں نے کچھ دن پہلے "فارایور" نامی کمپنی میں کام شروع کیا ہے۔ اس کا طریقہ کار کچھ یوں ہے کہ کمپنی نے اپنی پراڈکٹس کو کچھ پوائنٹ دیے ہوئے ہیں، جنہیں "cc" کہتے ہیں۔ کمپنی کو ایک بار 2cc کارٹن اوور کر کے دینا ہوتا ہے، یعنی تقریباً 58000 روپے کی پراڈکٹس خریدنی ہوتی ہیں۔ میں نے یہ پیک خرید لیا ہے۔ اب اگر میں کسی اور کو کمپنی میں بزنس کرواؤں گی تو کمپنی مجھے پہلے لیول پر ایک بندے کا 20 فیصد کمیشن دے گی جو تقریباً 13000 بنتا ہے۔ یہ بندہ آگے لوگوں کو شامل کروائے گا۔ جتنے لوگ شامل ہوں گے، ان سب کے cc میرے 2cc میں شامل ہوتے رہیں گے۔ جب میرے 5cc2 ہو جائیں گے تو میں دوسرے لیول پر پہنچ جاؤں گی۔ اس میں مجھے اس بندے کا 25 فیصد کمیشن لے گا، جسے میں شامل کرواؤں گی اور اگر میری ٹیم میں کوئی کسی کو شامل کرواتا ہے تو مجھے اس کا 5 فیصد کمیشن ملے گا۔ اسی طرح لیول بڑھتے جاتے ہیں اور آمدن بھی بڑھتی جاتی ہے۔

برائے مہربانی مجھے یہ بتادیں کہ یہ کام حلال ہے یا حرام؟ کیوں کہ یہ پراڈکٹس فائدہ مند ہیں اور بہت سے لوگ صحت کے لیے خریدتے بھی ہیں۔

جواب: واضح رہے کہ سوال میں مذکور کاروبار مندرجہ ذیل وجوہات کی بنا پر جائز نہیں ہے:

1. لوگوں کو چیز فروخت کروا کر کمیشن لینا اجارے (ملازمت) کے تحت آتا ہے، جسے پراڈکٹس کی خریداری کے ساتھ مشروط کر دیا گیا ہے۔ یوں ایک عقد (معاملے) میں دو سے عقد کو جمع کیا گیا ہے جو شرعًا ناجائز ہے۔
2. ان پراڈکٹس کی خریداری سے اکثر نیٹ ورکنگ کے کام میں شامل ہونا ہی مقصود ہوتا ہے جو اجارے کے تحت آتا ہے۔ معاملات میں اس چیز کا اعتبار ہوتا ہے جو مقصود ہو، چوں کہ اس ادائیگی کا مقصد اجارے (نیٹ ورکنگ) کا حق خریدنا ہوتا ہے جو کہ شرعًا حق مجرّد کی بیع ہے، لہٰذا یہ خریداری ناجائز ہے اور اس کے لیے پیسے ادا کرنا بھی شرعًا جائز نہیں ہے۔
3. جو رقم کمپنی کو ادا کی جاتی ہے وہ اس اُمید پر ادا کی جاتی ہے کہ مزید ممبر بنانے پر کمپنی سے کمیشن ملے گا اور نفع ہوگا، چوں کہ ممبر بننا اور نفع ہونا یقینی نہیں ہوتا لہٰذا یہ شرعًا جوا بنتا ہے اور اس ذریعے سے ہونے والا نفع سود کے زمرے میں آتا ہے۔
4. پہلے ممبر کے بعد آگے بننے والے ممبرز کی خریداری سے اس شخص کا براہِ راست تعلق نہیں ہوتا، جس کی وجہ سے اسے جو کمیشن ملتا ہے وہ اس کے اپنے کام کے بغیر ملتا ہے، چوں کہ اُجرت کسی کام کے بدلے ہوتی ہے، لہٰذا یہاں اُجرت لینا بھی شرعًا جائز نہیں ہے۔

سودا ختم کرنے کے بعد نفع کا مطالبہ کرنا

سوال: سعید نے عاصم سے ایک گھر مبلغ =/530,000 روپے پاکستانی پر لیا جو کہ زیرِ تعمیر تھا، جس میں سے سعید نے عاصم کو =/500000 روپے پاکستانی دے دیے۔ گھر کی تعمیر اور پیسوں کی وصولی کا وقت اٹھارہ ماہ مقرر ہوا۔ 18 ماہ گزرنے کے باوجود سعید نے 5 لاکھ روپے کے علاوہ ایک پائی بھی عاصم کو نہیں دی۔ دو سال کے بعد سعید نے عاصم سے اپنی رقم کی وصولی کا مطالبہ کیا، جس میں عاصم نے سعید کو دو لاکھ پچاس ہزار روپے واپس کیے۔ ایک سال بعد عاصم نے مذکورہ گھر نامکمل حالت میں تاوان پر بیچ دیا۔ اب سعید عاصم سے منافع کا مطالبہ کرتا ہے اور عاصم نے جو تاوان کیا ہے، سعید تاوان تو سرے سے مانتا نہیں، بلکہ الٹا اس کو گالی گلوچ اور دھمکیاں دیتا ہے کہ مجھے ہر حال میں منافع دینا ہے۔ شریعت کی رو سے کیا سعید کا مطالبہ جائز ہے؟ اور کیا یہ سود کے زمرے میں آتا ہے؟

جواب: صورت مسؤلہ میں سعید نے عاصم سے سودا ختم کرتے ہوئے جب اپنے دیے گئے پانچ لاکھ روپے کی واپسی کا مطالبہ کیا اور ڈھائی لاکھ وصول بھی کر لیے تو مذکورہ زیرِ تعمیر گھر سے سعید کی ملکیت بھی ختم ہو گئی اور وہ گھر عاصم کی ملکیت ہو گیا اور اس کے نفع نقصان کا مالک بھی عاصم ہو گیا، البتہ بقیہ ڈھائی لاکھ روپے عاصم کے ذمہ واجب الادا ہیں۔ پس سودا ختم کرنے کے ایک سال بعد جب عاصم نے وہ گھر فروخت کیا تو عاصم نے اپنی ہی مملوکہ چیز میں تصرف کیا، جس کا حق عاصم کو شرعًا حاصل تھا، لہٰذا سعید کی جانب سے اب نفع کا مطالبہ شرعًا درست نہیں۔ اگر سودا ختم نہیں ہوا تھا تو پھر جواب کی نوعیت کچھ اور ہوگی، ایسی صورت میں دوبارہ دریافت کر لیا جائے۔ فقط واللہ اعلم!

سبز ہلالی پرچم

حفصہ محمد فیصل

کسی بھی قوم کے لیے آزادی کا دن کسی بڑی نعمت سے کم نہیں ہوتا، مگر آزادی کی حقیقت اور اہمیت کو وہی سمجھ سکتا ہے، جس نے غلامی کی سی زندگی گزاری ہو۔ یہ عظیم مسلمانوں کی قربانیوں کا ثمر ہے کہ تاریخ نے کروٹ لی اور 14 اگست 1947 کی مبارک ساعت کو قافلہ حق منزلِ مقصود پر آ پہنچا۔ ایک نئی اسلامی مملکت کا سورج پوری آب و تاب سے دنیا پر درخشندہ ستارے کی مانند نمودار ہوا، جو حصولِ مملکت کے لیے جانوں کا نذرانہ دینے والوں کو خراجِ عقیدت پیش کر رہا تھا۔ سبز ہلالی پرچم مجھے ہمیشہ ہی ایک خوب صورت احساس سے مالامال کرتا۔

میں بچپن میں ہر سال 14 اگست پر جھنڈیاں لگاتی اور اس کا اہتمام اگست کے شروع ہوتے ہی ہو جاتا۔ دل چاہتا پورا آنگن، چھت، گلیاں، چوبارے اس سبز ہلالی پرچم سے سجادوں، مگر یومِ آزادی کا سورج ڈوبتے ہی کہاں جھنڈیاں، کہاں پرچم۔۔۔؟ تھک ہار کر سو جاتی۔ اگلے دن جھنڈیاں پیروں میں رُلتیں، مگر اس کی قدر و قیمت کا احساس کوئی نہ دلاتا۔ اب یہ کچرا بن گئی ہیں، اسے ایک معمول کی بات سمجھا جاتا۔

ایسے ہی ایک یومِ آزادی پر ایک ایسا منظر دیکھا، جس نے بنا کچھ کہے اور سنے عملی طور پر سبز ہلالی پرچم کی قدر و قیمت دل میں جاگزیں کر دی اور اس وقت اپنے پچھلے رویے پر دل تڑپ تڑپ اُٹھا۔

ہوا کچھ یوں کہ: "یومِ آزادی پر ہمارے علاقے میں میلہ لگا تھا۔ سبز پرچم کو ہاتھ میں تھامے سہیلیوں کے ہم راہ ہم بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ میلے کی رونق میں ہم نے سبز ہلالی پرچم کو کہیں پیچھے چھوڑ دیا، لیکن جب کھیل کود کر پلٹے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک خاکروب ہمارے پرچم کو عقیدت سے آنکھوں سے لگا کر ایک شاپر میں ڈال رہا ہے اور اسی تھیلے میں کئی کٹی پھٹی سبز جھنڈیاں بھی جھانک رہی تھیں۔ اس خاکروب کے پاس دو تھیلے تھے۔ ایک میں وہ کچرا جمع کر رہا تھا، جب کہ دوسرے میں صرف جھنڈیاں تھیں، جو گلیوں، چوباروں اور فٹ پاتھوں پر گر کر بکھر گئی تھیں۔

اور عقیدت کی انتہا کہ وہ خاکروب ہر جھنڈی کو اٹھا کر پہلے آنکھوں سے لگاتا پھر تھیلے میں ڈالتا۔

اس وقت سبز ہلالی پرچم اور آزادی کی قدر و قیمت کا دل سے اندازہ ہوا۔ اس دن کے بعد ہمارے معمول میں تبدیلی آئی۔ اب زیادہ جھنڈیاں لینے اور لگانے کے بجائے ان پیسوں سے کسی غریب کی مدد کرنا اور پودے خریدنے کا معمول بن گیا اور سبز جھنڈیوں کی قدر و قیمت اپنے سے چھوٹوں کو بتانے کا بیڑہ اٹھا لیا۔ اب ہمارے ارد گرد کہیں کوئی جھنڈی گری پڑی نہیں ملتی، البتہ ایک بڑا پرچم اونچا لگانے اور لہرانے کا اہتمام ضرور ہوتا ہے۔

چاند روشن، چمکتا ستارہ رہے
سب سے اونچا یہ جھنڈا ہمارا رہے

بقیہ

اللہ سے عافیت مانگو

جسم کی سلامتی کا مطلب بیماریوں کا خاتمہ، غموں اور مشکلات سے چھٹکارا۔ اولاد میں عافیت یہ ہے کہ ایسی مبارک ذریت جس سے آنکھوں کو ٹھنڈک، دلوں کو خوشی اور سعادت حاصل ہو۔ وطنوں میں عافیت یہ ہے کہ وطن بدامنی اور جنگوں سے محفوظ ہو۔ اگر وطن میں امن و سلامتی نہ ہو تو نہ صحت میں مزہ، نہ کھانے پینے میں کوئی لذت، نہ سواری میں کوئی راحت، نہ مال و دولت سے لطف اندوز ہو سکے۔ وطن کی عافیت سب سے عظیم اور شاندار عافیت میں سے ہے۔

مسلمانو! دنیا کی عافیت میں سے ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے اور لوگ آپ کے شر سے محفوظ رہیں۔ آپ اُن کی اذیت سے دور رہیں اور آپ کی اذیت سے اللہ اُن کو محفوظ رکھے۔

آخرت میں عافیت یہ ہے کہ بندہ اپنے رب سے اِس حال میں ملے کہ اُس کی گردن پر کسی کا ناحق خون نہ ہو اور کسی کی حق تلفی نہ ہوئی ہو اور آخرت میں کوئی آپ سے اپنے حق کا مطالبہ نہ کرے۔ کسی کے معاملات میں تفرقہ نہ ڈالا ہو۔

مسلمانو! پردہ اور بے نیازی عافیت میں سے ہے، بندہ ہر چیز سے اُکتا جاتا ہے سوائے عافیت کے۔

مسلمانو! تم عافیت کی عظمت کو جانو۔ رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات پر غور کرو۔ لوگو! دشمن سے مقابلے کی آرزو نہ کرو بلکہ اللہ سے عافیت مانگو! اگر کبھی دشمن سے مقابلہ ہو تو صبر کرو۔ کیا جہاد سے بڑھ کر کوئی عمل ہے اور اللہ کی راہ میں شہادت سے بڑھ کر بھی کوئی مقصد ہے۔

بوسیدہ چٹائی جس پر بندہ سوئے اور وہ عافیت سے ہو، اُس نرم و گداز بستر سے بہتر ہے جس پر تم بیمار پڑے رہو۔ آدمی عافیت پانے کے لیے دوا کی کڑواہٹ برداشت کر لیتا ہے اور عافیت کی خاطر لذیذ کھانے چھوڑ دیتا ہے، چناں چہ عافیت انسان کا سب سے خوب صورت اور قیمتی لباس ہے، یہ زندگی کی لذّت اور لوگوں کے سکون کا ذریعہ ہے۔ یہی مردہ و زندہ لوگوں کی چاہت ہے اور قبروں میں پڑے ہوئے مردہ لوگوں کی زیارت کی دعاؤں میں سے ہے۔

نَسْئَالُ اللّٰہَ لَنَا وَلَکُمُ الْعَافِیَۃَ ہم اللہ سے اپنے لیے اور آپ کے لیے عافیت مانگتے ہیں۔

تم اپنے اللہ سے عافیت مانگتے رہو، اگر عافیت نہ ہو حالت مکدر ہو جاتی ہے اور دل مضطرب ہو جاتے ہیں اور کوئی راحت عافیت کے بغیر ممکن نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر آزمائش سے بندے کی حفاظت کرے اور اپنے فضل و کرم سے ہر بھلائی عطا کرے اور ایسا کیسے نہ ہو جبکہ حضرت عبداللہ ابنِ عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ دعاؤں میں اللہ کو سب سے زیادہ عافیت پسند ہے۔

اے اللہ! ہم تجھ سے معافی و معافات اور دنیا و آخرت کی دائمی عافیت کی دعا کرتے ہیں اور اپنے اہل و عیال کے لیے عافیت کا سوال کرتے ہیں۔ اے اللہ ہم تیری پناہ چاہتے ہیں، نعمتوں کے زائل ہونے سے اور یکایک آنے والے تیرے عذاب سے اور تیری ناراضی سے پناہ چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، تمہیں جتنی بھی نعمتیں دی ہیں سب اُسی کی دی ہوئی ہیں، جب تم پر کوئی مصیبت آ جائے تو اُسی سے نالہ و فریاد کرو اور جب وہ تم سے مصیبت ٹال دے تو اُس کے ساتھ شرک نہ کرنے لگ جاؤ۔ اللہ تعالیٰ مجھے آپ کو اپنی کتاب کے طریقے اور نبی کریم ﷺ کی سنت سے فائدہ پہنچائے۔ اللہ تعالیٰ سے ہر گناہ سے مغفرت طلب کرتے رہو، وہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔

پاکستان: آزاد ہوا؟ یا بنایا گیا؟

ایک تحقیقی اور معلوماتی جائزہ

عذرا خالد

پاکستان کی تشکیل بلاشبہ بیسویں صدی کے سب سے اہم جغرافیائی اور سیاسی واقعات میں سے ایک ہے۔ یہ سوال کہ آیا پاکستان 'بنا' یا 'آزاد ہوا' ایک پیچیدہ بحث ہے، جو تاریخی، سیاسی اور نظریاتی پہلوؤں پر مشتمل ہے۔ اس مضمون میں ہم اس سوال کا تفصیل سے جائزہ لیں گے۔ بنایا گیا یا آزاد ہوا دونوں پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھیں گے۔ اس کے لیے تاریخی شواہد کو بھی مدِّ نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔

آزادی کا نقطۂ نظر: آزادی کا مقصد برطانوی راج سے نجات حاصل کرنا تھا۔ پاکستان کے قیام کو اگر 'آزاد' ہونا کہا جائے تو تاریخی شواہد اس بات پر زور دیتے ہیں کہ یہ برطانوی استعمار سے آزادی کی تحریک کا نتیجہ پاکستان کی آزادی تھا۔

برِّصغیر پاک و ہند پر تقریباً 200 سال سے زائد عرصے تک برطانوی راج قائم رہا اور اس عرصے میں مقامی آبادی کو یعنی پورے ہندوستان کے عوام کو سیاسی، معاشی اور سماجی استحصال کا سامنا رہا۔

1947 میں جب برطانوی حکومت نے برِّصغیر کو تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا تو یہ دراصل ایک طویل جدوجہد کا ثمر تھا، جس میں لاکھوں افراد نے حصہ لیا۔

ایک نقطۂ نظر کے مطابق: تحریکِ پاکستان درحقیقت ایک وسیع تر ہندوستانی جدوجہد آزادی کا حصہ تھی، جس کا مقصد غیر ملکی حکمرانی سے نجات حاصل کرنا اور ان کو وہاں سے نکال باہر کرنا تھا۔

ہندوستان کے مسلمانوں نے حقِّ خود ارادیت کا استعمال کرتے ہوئے ایک الگ وطن کا مطالبہ کیا، جہاں وہ اپنی مذہبی، ثقافتی اور سماجی شناخت کو برقرار رکھ سکیں۔ آزادی کے نتیجے میں پاکستان ایک نئی، خود مختار قومی ریاست کے طور پر دنیا کے نقشے پر وجود میں آیا، جس کے اپنے قوانین، حکومت اور عالمی سطح پر شناخت تھی۔ اس نقطہ نظر کے مطابق پاکستان کا قیام صرف ایک انتظامی تقسیم نہیں تھا بلکہ برطانوی سامراج سے آزادی اور ایک علیحدہ ملک اور مسلم قوم کے سیاسی اظہار کی جدوجہد تھی۔

پاکستان 'بننے' کا نقطۂ نظر: پاکستان 'بننے' کا نقطۂ نظر اس بات کو واضح کرتا ہے کہ پاکستان کا قیام ایک منظّم اور دانستہ تشکیلی عمل کا نتیجہ تھا، جس میں ایک نئی ریاست کی بنیادیں رکھی گئیں۔ یہ نقطۂ نظر اس حقیقت پر توجہ مرکوز کرتا ہے کہ پاکستان محض موجودہ علاقوں کو ایک جا کرنے سے نہیں بنا بلکہ نظریاتی، جغرافیائی اور انتظامی طور پر وجود میں آیا۔

پاکستان کا وجود کسی اتفاقی واقعے کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ یہ دو قومی نظریے کی بنیاد پر ایک طویل فکری عمل سے وجود میں آیا۔ علامہ اقبالؒ اور قائدِاعظم محمد علی جناح جیسے رہنماؤں نے مسلمانوں کے لیے ایک الگ تشخص اور وطن کے تصوّر کو پیش کیا۔

پاکستان کا قیام ایک گہری سیاسی اور آئینی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ اس کے قیام کے لیے ہر لحاظ سے سیاسی جدوجہد کی گئی۔ ہر سیاسی حربہ استعمال کیا گیا۔ اس کے لیے گول میز کانفرنسوں، آئینی اصلاحات اور جمہوری عمل کے ذریعے مطالبات پیش کیے گئے۔

پاکستان کے قیام میں پنجاب، سندھ، بلوچستان، شمال مغربی سرحدی صوبہ (خیبر پختونخوا) اور مشرقی بنگال کے مسلم اکثریتی علاقوں کو یک جا کیا گیا، جو ایک پیچیدہ جغرافیائی اور انتظامی تقسیم کا عمل تھا۔ اس میں نئی سرحدوں کا تعین، اثاثوں کی تقسیم اور ایک نئے ریاستی ڈھانچے کی تشکیل شامل تھی۔

قیام کے بعد پاکستان نے اپنی فوج، عدالتی نظام، انتظامی ڈھانچا اور دیگر ریاستی اداروں کو از سرِ نو تشکیل دیا، جو ایک 'بننے' والے ملک کی نشانی ہے۔

دونوں نکات (پاکستان بنا، یا آزاد ہوا) کا امتزاج اور تاریخی حقیقت اسلامی جمہوریہ پاکستان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کے قیام کو نہ تو محض 'آزادی' کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے اور نہ ہی صرف 'بننے' کے طور پر۔ یہ دونوں عمل ایک دوسرے سے گہرے طور پر جڑے ہوئے ہیں۔

پاکستان، برطانوی راج سے 'آزاد' ہوا، اس لحاظ سے کہ اسے غیر ملکی حکمرانی سے نجات ملی۔ یہ آزادی عالمی سطح پر نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کی ایک بڑی اور اہم لڑی تھی، یہاں اس تاریخی حقیقت کا بھی اعتراف کرنا ضروری ہے کہ پاکستان کا قیام صرف ایک نوآبادیاتی طاقت سے چھٹکارا نہیں تھا، بلکہ ایک نئی اور خود مختار مسلم ریاست کا شعوری اور جمہوری 'تشکیل' کا عمل بھی تھا۔

یہاں یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ آزادی ایک وسیلہ، ریاست کی تشکیل ایک بڑا مقصد لے کر مسلمانانِ ہند میدانِ عمل میں آئے تھے۔

تحریک آزادی نے برِّصغیر کو انگریزوں سے آزادی دلائی، لیکن مسلمانوں کے لیے اس آزادی کا مقصد ایک الگ وطن کا قیام تھا، جہاں وہ اپنے مذہب اور اصولوں کے مطابق زندگی گزار سکیں۔ اس لیے آزادی ایک وسیلہ تھی، جس کے ذریعے پاکستان کو 'بنایا' گیا۔

سیاسی و نظریاتی پس منظر:

'بنا' کا عمل ایک مضبوط نظریاتی بنیاد پر استوار تھا جو دو قومی نظریے پر مبنی تھا۔ اس نظریے نے مسلمانوں کو اپنے لیے ایک الگ منزل یعنی وطن متعین کرنے کی سوچ اور حوصلہ دیا۔

پاکستان کی آزادی اور اس کا 'بننا' ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں۔ آزادی نے ریاست کی تشکیل کا راستہ ہموار کیا اور ریاست کی تشکیل نے اس آزادی کو ایک مستقل شناخت اور استحکام فراہم کیا۔

پاکستان کا قیام ایک منفرد تاریخی واقعہ ہے، جس میں آزادی اور تشکیلی عمل دونوں ہی عمل شامل ہیں۔ یہ برطانوی استعمار سے ایک قوم کی آزادی تھی، جس نے اپنے حقِّ خود ارادیت کا استعمال کرتے ہوئے ایک نئی قومی ریاست کی بنیاد رکھی۔ اس لیے یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ پاکستان 'آزاد' بھی ہوا اور 'بنا' بھی۔ اس نے صدیوں پرانے غیر ملکی تسلط سے نجات حاصل کی اور اس کے ساتھ ہی ایک نئے ملک، ایک نئے آئین اور ایک نئی شناخت کے ساتھ دنیا کے نقشے پر ابھرا۔ یہ ایک ایسی قوم کی داستان ہے، جس نے اپنی منزل خود متعین کی اور اسے حاصل کرنے کے لیے بے پناہ قربانیاں دیں۔

Perfect
FRESHENER

CELEBRATING 78TH

PAKISTAN
INDEPENDENCE DAY
1947

ProudlyMadeInPakistan

میں آزاد ہوں

انیلہ افضال ایڈووکیٹ

وہ میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ تڑپ رہا تھا۔ سسک رہا تھا۔ میری نظریں اس کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ ستر پچھتر سال کا ہو کر بھی وہ چہرے سے جوان دکھائی دے رہا تھا۔ اچھا خاصا وجیہ تھا۔

ایک کھلے میدان میں اسے زنجیروں سے باندھا گیا تھا۔ پیروں میں بیڑیاں اور گلے میں طوق بھی تھا۔ میدان میں ایک قیامت خیز رقاصہ ہوش ربا رقص کر رہی تھی۔ اس کی شراب آنکھیں اور گلاب ہونٹ دعوتِ نظارہ دے رہے تھے۔ میدان میں چھوٹے بڑے کئی گدھ یہاں سے وہاں گھوم رہے تھے۔ آتے جاتے وہ گدھ اس کا گوشت نوچتے تو وہ چیخ ہی پڑتا تھا، "دیکھو! دیکھو اب میرے قریب نہ آنا، تم مردار کھانے والے ہو اور میں! میں تو زندہ ہوں! زندہ اور جاوید ہوں۔" وہ چیختا تو رقاصہ کی رقص میں اور تیزی آ جاتی اور زہریلی مسکراہٹ اس کے لال چٹک ہونٹوں پر پھیل جاتی۔ یہ تماشا جاری تھا، میری نظریں میدان میں گھوم رہی تھی۔ میں اس کے لیے کسی مددگار اور ہمدرد کو کھوج رہی تھی، مگر وسیع میدان گدھوں سے اٹا پڑا تھا۔ گدھوں کے علاوہ وہاں صرف زنجیریں تھیں، رقاصہ تھی اور میں تھی۔ میرا دل اس کے درد کو محسوس کر رہا تھا، مگر میں کر ہی کیا سکتی تھی۔ اچانک میری نگاہ ایک کونے میں کھڑے کچھ سفید بگلوں پر پڑی۔ میرے خشک ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھری مگر۔۔۔۔۔ مگر یہ تو اپنے پروں میں اپنے سروں کو چھپائے لاتعلق کھڑے تھے۔ میں نے انھیں آوازیں دیں، زور زور سے جھنجھوڑا، مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ تبھی اس سے لپٹی ایک زنجیر زخمی سانپ کی طرح پھنکارتی ہوئی میری جانب لپکی اور میرے پیر کو لپیٹ کر مجھے اس کے پاس لا پٹخا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ساری زنجیریں مجھ پر پِل پڑیں۔ کئی گدھ بھی میری جانب لپکے اور وہ میری ڈھال بن کر کھڑا ہو گیا۔ ہٹو! جاؤ! چھوڑو! بھاگو! وہ چیخ رہا تھا۔ اس پر کیوں پِل پڑے ہو؟ اس بیچاری کا قصور ہی کیا ہے؟

"ہاہاہاہاہا!" رقاصہ کے ہونٹوں سے زہر قند قہقہہ نکلا۔ "قصور پوچھتے ہو اس کا؟ جو بھی تم سے ذرا سی بھی ہمدردی رکھے گا وہ ہم سے بچ نہ سکے گا۔ بھول گئے؟ کیسے ہم سب نے مل کر تمہارا بازو کاٹ دیا تھا؟ اور تمہارے گلے کا یہ طوق؟"

میری نظر اس کے کندھے پر پڑی جہاں سے خون رِس رہا تھا اور گلے کا طوق تو ایسا تھا کہ اس سے سیدھا ہو کر کھڑا ابھی نہیں ہو جا رہا تھا۔

"کچھ نہیں بھولا میں! تم سب نے مل کر میرا تماشا بنا دیا ہے۔ میرا وجود کاٹ دیا ہے۔ گلے میں پھانس بن گئے ہو اور یہ گدھ مجھے کئی دہائیوں سے نوچ کھسوٹ رہے ہیں۔ جگہ جگہ سے میرا گوشت کھا رہے ہیں۔ اب اور کیا چاہتے ہو مجھ سے؟ مجھے چھوڑ دو، جاؤ چلے جاؤ سب یہاں سے۔ مجھے چھوڑ دو، مجھے آزادی چاہیے، آزادی! آزادی! آزادی!"

وہ حلق کے بل چیخا تھا۔ اس کی آواز کی گرج اور کھنک نے ایک بار تو سب کو ہلا ہی دیا تھا۔ سبھی گدھ اڑ کر دور چلے گئے تھے۔ کونے میں کھڑے بگلوں نے بھی پل بھر کو اپنے سر پروں میں سے نکال کر اس تبدیلی کو دیکھا تھا اور پھر سے آنکھیں موند کر گردنیں جھکا لی تھیں۔

"ہاہاہاہاہاہاہا! آزادی؟ آزادی چاہتے ہو؟ وہ تمہیں کب کی دی جا چکی ہے۔ یاد نہیں؟ پون صدی پہلے!" رقاصہ نے اپنے گال اس کے رِستے ہوئے گالوں سے رگڑے۔

چلی جاؤ یہاں سے، دور ہو جاؤ! مجھے تم سے نفرت ہے۔ وہ گرجا! اب اس کی آواز پہلے سے قدرے مضبوط تھی۔ صرف اس پیاری لڑکی کو میرے پاس رہنے دو، یہ سچ میں مجھے چاہتی ہے۔

"ہونہہ! یہ اکیلی لڑکی، یہ کیا کر لے گی تمہارے لیے؟ بہت جلد یہ میرے عشق میں ڈوب کر ان جیسی ہو جائے گی۔" رقاصہ نے گدھوں کی جانب اشارہ کیا۔

اس نے گھبرا کر میری طرف دیکھا۔

"نن نہیں! میں ان جیسی نہیں ہوں۔"

"ہونہہ! سبھی یہی سوچتے ہیں، مگر پھر۔۔۔۔۔اس حمام میں سبھی ننگے ہیں۔ نادان لڑکی!"

"نہیں! میں سب جیسی نہیں ہوں۔ میں سمجھ گئی ہوں کہ یہ زندہ ہے تو میں زندہ ہوں اور میں رہوں یا نہ رہوں یہ زندہ رہے گا۔" میرے لہجے میں بلا کا عزم تھا۔

"ہاہاہاہاہاہا!" اس بار یہ قہقہہ اس کے ہونٹوں سے بلند ہوا تھا۔ زندگی سے بھرپور قہقہہ! فخر سے چور قہقہہ!

"اب کیا کہتی ہو؟ تم نے تو مجھے مجبور ہی سمجھ لیا تھا۔ دیکھو! دیکھو میرے چاہنے والے مجھے ہرگز مرنے نہیں دیں گے۔"

"ہاں! میں تمہیں مرنے نہیں دوں گی۔ تم میری زندگی ہو۔" یہ کہتے ہوئے میں نے لمبی جست لگائی۔ میرا انتظار کرنا، امید نہ چھوڑنا، میں جلد ہی لوٹ کر آؤں گی۔ کئی گدھ اور کئی، زنجیریں میری جانب لپکیں، مگر میں سب کو پھلانگتی ہوئی تیز دوڑ رہی تھی۔ میدان کے کونے میں کھڑے سفید بگلوں نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ ان کے لبوں پر موہوم سی مسکراہٹ ابھری اور انھوں نے گردنیں جھکا لیں۔ میں دوڑ رہی تھی۔ کالجوں میں، یونیورسٹیوں میں، شاپنگ مال، مارکیٹیں، گلیاں، محلے، ہر جگہ۔۔۔ میرے پاؤں شل ہو رہے تھے، مگر مجھے اسے بچانا تھا۔ اپنے جیسوں کو جمع کرنا تھا۔ اسے آزادی دلانا تھی۔ وہ مجھے جان سے پیارا تھا۔ وہ میری پہچان، میری شناخت تھا۔

اور جب میں لوٹی تو اکیلی نہ تھی، ہزاروں لاکھوں مجھ جیسے میرے ساتھ تھے۔ اس کے متوالے، اس سے پیار کرنے والے۔ میری مستانہ فوج کو دیکھ کر گدھ بے جان ہو گئے، زنجیریں ٹوٹنے لگیں اور رقاصہ کا ہوش ربا رقص تھم گیا۔ مانو کسی نے اس کی روح کھینچ لی تھی۔ میدان کے کونے میں کھڑے بگلوں نے پروں میں سے گردنیں نکالیں، ان کی کوکیں آسمانوں میں گونجنے لگیں تھیں۔ آسمان سے دھن برسنے لگا تھا۔ رقاصہ اس دھن کی بارش تلے دب کر مر گئی تھی۔ اب وہ آزاد تھا۔ اس کے زخم بھرنے لگے تھے۔ وہ قہقہے لگا رہا تھا خوشی سے بھرپور مستانہ قہقہے، زندگی سے بھرپور آزاد قہقہے!

یہ کیسی آزادی ہے؟

امۃ الرحمٰن

کسی بھی قوم کے لیے آزادی ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ ہر سال 14 اگست آتا ہے اور ہم جھنڈے لہراتے ہیں، نغمے گاتے ہیں، سبز لباس پہنتے ہیں، آتش بازی کرتے ہیں، لیکن کیا ہم نے کبھی رُک کر سوچا؟ صرف ایک لمحے کے لیے۔۔۔ کیا واقعی ہم آزاد ہیں؟ کیا صرف زمین کا ٹکڑا حاصل کر لینا ہی آزادی کہلاتا ہے؟ یا آزادی وہ ہے جو روح کو غلامی سے نکالے، سوچ کو آزاد کرے اور دین پر جینے کا حق دے؟

ہم نے 1947 میں انگریز سے زمین لی، لیکن 2025 میں بھی ہم مغرب سے نظریات لے رہے ہیں۔ ہم نے لا الہ الّا اللہ کے نام پر وطن لیا، مگر اس لا الہ کا نظام کہاں ہے؟ نہ معاشرت میں، نہ معیشت میں، نہ تعلیم میں، نہ قانون میں۔

تو کہیے۔۔۔ کیا ہم واقعی آزاد ہیں؟ یا صرف خود کو آزاد سمجھنے کا دھوکہ جیت رہے ہیں؟

پاکستان کوئی اتفاقی جغرافیہ نہیں تھا؛ یہ ایک نظریہ تھا، اسلامی طرزِ حیات کا قلعہ۔ مسلمانوں نے اس ملک کے لیے صرف خون نہیں دیا، ایمان کی قسمیں کھائی تھیں۔ امرتسر، دہلی، کانپور، لکھنؤ۔۔۔ جہاں کہیں بھی کلمہ گو تھے، سب ایک ہی منزل کے مسافر تھے۔ انھیں صرف زمین نہیں چاہیے تھی، وہ چاہتے تھے اذان کی گونج میں سانس لینا، قرآن کو آئین بنانا اور شریعت کے سائے تلے جینا۔

کیا ہم اس نظریے کے وفادار ہیں؟

ہم نے رفتہ رفتہ اپنے نظریاتی سرمایے کو خوش نما خوابوں کی قیمت پر نیلام کر دیا ہے۔

جب مہاجرین پاکستان کی طرف آ رہے تھے، امرتسر سے لاہور آنے والی ٹرین جب پلیٹ فارم پر رُکی تو لاشوں سے بھری ہوئی تھی۔

یہ خون۔۔۔ کس کے لیے تھا؟ یقیناً پاکستان کے لیے!

اگر آزادی کا مطلب صرف سرحدیں تھیں تو ہم نے لا الٰہ الا اللہ کیوں کہا تھا؟

”آزادی صرف زمین کی نہیں ہوتی، بلکہ سوچ، عقیدے، دین، غیرت، تہذیب اور طرزِ زندگی کی آزادی بھی ہوتی ہے۔“

اگر آج ہم ظاہری طور پر آزاد ہیں، لیکن اس آزادی سے غلامی جھلک رہی ہے۔ مغربی میڈیا کی اندھی تقلید کر رہے ہیں۔ مغربی اندازِ حیات نے ہمیں اندر سے غلام کر رکھا ہے۔ لباس، زبان، رسوم، تعلیم۔۔۔ سب کچھ میں ہم مغربی طور طریقے اپنا رہے ہیں۔ ہمارا جسم آزاد ہے، لیکن ہماری سوچ اب بھی دوسروں کے اشارے پر چلتی ہے۔

ہم امتِ مسلمہ ہیں، لیکن ہر چیز میں غیروں کی تقلید کر رہے ہیں، جبکہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ (سنن ابوداؤد)

”جو کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے، وہ انہی میں سے ہے۔“

مغربی طرزِ لباس، فیشن، سوچ۔۔۔ کیا ہم واقعی آزاد ہیں؟

جس قوم نے دین کی بنیاد پر وطن حاصل کیا، جب وہ دین سے دور ہو گئی تو زوال ناگزیر تھا۔

دین سے غفلت عام ہو چکی ہے۔

آج ہر جگہ سود، زنا، فحاشی، میڈیا پر بے حیائی اور دینی شعائر کی بے وقعتی پائی جاتی ہے۔

ہم خود جائزہ لیں: نماز اور قرآن کا ہمارے دن میں کتنا حصہ ہے؟

وہ قوم جس نے لا الہ الّا اللہ کے نعرے پر جانیں دیں، وہی قوم آج لا الہ الّا اللہ کے تقاضوں سے غافل ہو چکی ہے۔

آزاد کون ہے؟

آزاد وہ ہے جو نفس اور شیطان کی قید سے نکلے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَىٰ (طٰهٰ: 123)

”جو میری ہدایت کی پیروی کرے گا، وہ نہ گم راہ ہو گا، نہ بدبخت۔“

آزادی وہ مطلوب ہے، جس میں اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تابع ہونا ہے جو دین پر چلے گا، وہی آزاد ہو گا۔ باقی سب قید ہیں، نفس کے غلام۔۔۔

جیسا کہ حدیث میں آتا ہے:

الدُّنْيَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ، وَجَنَّةُ الْكَافِرِ (صحیح مسلم)

”دنیا مؤمن کے لیے قید خانہ اور کافر کے لیے جنّت ہے۔“

ہم نے دنیا ہی کو جنّت سمجھ لیا، جب کہ حقیقت میں یہ غلامی ہے، گویا ہم نے زمین تو حاصل کر لی، مگر دل ابھی بھی غلام ہیں۔

اب سوال یہ ہے: ہم کیا کر سکتے ہیں؟

- اس 14 اگست کے موقع پر آزادی کو صرف نعرہ نہ بنائیں، شعور بنائیں۔
- دینی شعائر کو اپنائیں: قرآن، سنت، حیا، غیرت۔
- اپنی آئندہ نسلوں کو دینی تعلیم دیں۔
- یومِ آزادی کو صرف جھنڈا لہرانے کا دن نہ بنائیں، بلکہ شکر، نفل، درسِ قرآن اور شہدا کی یاد سے مزین کریں۔

”ہمیں پاکستان تو اللہ نے دے دیا، اب ہمیں اللہ کا پاکستان بنانا ہے۔“

”آزادی صرف جشن کا نام نہیں، یہ لا الہ الّا اللہ کے پرچم کو بلند رکھنے کا عہد ہے!“

”یہ وطن صرف ہمارے جسموں کی پناہ نہیں، ہماری روحوں کی امانت ہے۔“

گویا 14 اگست صرف جھنڈا لہرانے کا نہیں، دل کو قرآن کے رنگ میں رنگنے کا دن بنائیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں وہ پاکستان بنانے کی توفیق دے، جو اُس کے نام پر وجود میں آیا۔ آمین!!!

ماحولیاتی بحران اور اسلامی تعلیمات

حجاب سید

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ (الروم: 41)

عصرِ حاضر میں انسانی ترقی جہاں سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں بامِ عروج پر پہنچی ہے، وہیں اس ترقی نے کرۂ ارض کو شدید ماحولیاتی بحران سے دوچار کر دیا ہے۔ جنگلات کی بے دریغ کٹائی، آلودگی، قدرتی وسائل کا بے رحمانہ استعمال، فضائی اور آبی آلودگی اور عالمی درجۂ حرارت میں مسلسل اضافہ! آج کے انسان کو خود اس کی بقا کے بارے میں سوالات اٹھانے پر مجبور کر رہا ہے۔

اسلام جو کہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے، ماحولیاتی توازن اور فطرت کے احترام کی تعلیمات سے لبریز ہے۔ آئیے! ہم قرآنی آیات، احادیثِ مبارکہ، اقوالِ سلف اور تاریخی شواہد کی روشنی میں اس پہلو کا جائزہ لیں۔

قرآنِ مجید اور فطری توازن:

قرآنِ مجید میں فطرت اور ماحول کے توازن کو ایک الٰہی نظام قرار دیا گیا ہے، جس میں ہر چیز ایک مقرّرہ انداز میں اپنی خدمات سرانجام دے رہی ہے:

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ (الرحمٰن: 7-8)

اور آسمان کو بلند کیا اور اس میں توازن قائم کیا، تاکہ تم بھی توازن میں خلل نہ ڈالو۔

یہ "میزان" صرف معاشرتی انصاف نہیں بلکہ قدرتی توازن کی طرف بھی اشارہ ہے۔ اگر انسان اس توازن کو بگاڑے گا تو زمین فساد سے بھر جائے گی۔

فساد فی الارض اور ماحولیاتی بگاڑ:

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

خشکی اور سمندر میں فساد ظاہر ہو گیا ہے ان اعمال کے سبب جو لوگوں کے ہاتھوں نے کمائے۔

یہ فساد صرف معاشرتی یا اخلاقی نہیں بلکہ ماحولیاتی اور فطری فساد بھی ہے، جیسے درختوں کی بے دریغ کٹائی، جانوروں کی نسلوں کا خاتمہ یا فضائی و آبی آلودگی۔

1۔ احادیثِ نبوی اور ماحولیاتی تعلیمات:

نبی کریم ﷺ کی تعلیمات فطرت سے محبت اور ماحول کی حفاظت کی بھرپور نمائندگی کرتی ہیں:

درخت لگانا:

"جو شخص کوئی درخت لگاتا ہے، اس میں سے انسان یا پرندہ یا جانور کچھ کھاتے ہیں تو وہ اس کے لیے صدقہ ہوتا۔" (صحیح بخاری)

2۔ پانی کا اسراف ممنوع:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "بہتے پانی میں بھی اسراف نہ کرو۔" (ابن ماجہ)

3۔ صفائی: الطُّهُورُ شَطْرُ الْإِيمَانِ

صفائی نصف ایمان ہے۔ (صحیح مسلم)

"زمین کو پاک رکھو، کیوں کہ یہ تمہاری رہائش ہے۔" (جامع صغیر)

سیرتِ نبوی میں فطرت کا احترام:

نبی ﷺ نے "حِمیٰ" کا نظام قائم فرمایا جو کہ مخصوص علاقوں کو محفوظ فطری زون قرار دینا تھا، جہاں چراگاہوں یا درختوں کی کٹائی کی اجازت نہ تھی۔

(سیرۃ ابن ہشام، جلد 2)

غزوۂ تبوک کے سفر کے دوران رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کو ہدایت دی کہ کسی درخت یا پودے کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔ (مسند احمد)

اقوالِ سلف صالحین:

1۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں:

"زمین تمہاری ماں کی مانند ہے، اس سے ویسا ہی برتاؤ کرو جیسے ماں سے کرتے ہو۔"

2۔ امام غزالیؒ (احیاء العلوم) میں فرماتے ہیں:

"انسان اگر زمین کا خلیفہ ہے تو اس پر واجب ہے کہ وہ زمین کو فساد سے بچائے، نہ کہ تباہ کرے۔"

اسلامی تاریخ کے ماحولیاتی واقعات:

خلافتِ راشدہ کے دور میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے "حِمیٰ الربذہ" قائم کیا، جہاں

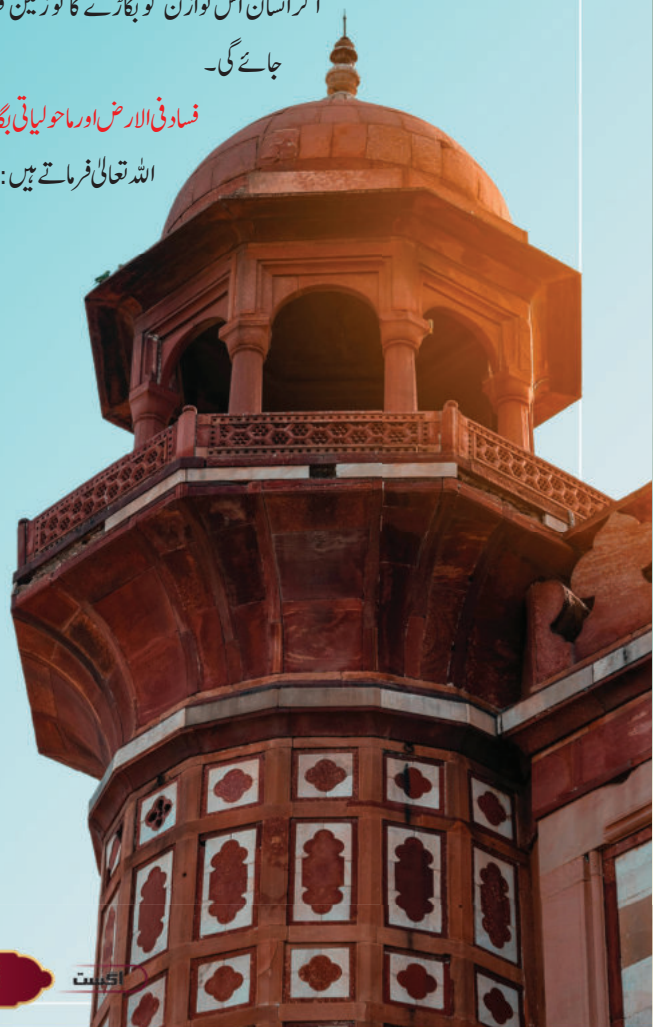

آزادی پاکر بھی قیدی

ندا اختر

خواب کس نے دیکھا، کس نے کی تکمیل۔۔۔ ہمیں فخر ہے کہ ہم آزاد ہوگئے۔

پاکستان واحد ملک ہے، جو لاالہ الااللہ کی بنیاد پر بنا۔

اس کی مٹی میں شہدا کے خون کی مہک ہے۔ یہ انصاف قائم کرنے، سب کو یکساں حقوق دینے کا علم بردار ہے۔

یہاں مسلمان ہی نہیں غیر مسلم بھی آزاد ہیں۔

ہر موسم کا رنگ اللہ نے اسے بخشا، ہر معدنی طاقت ہر گوہر نایاب اسے ملا۔

ہمیں وطنِ عزیز نے یہ شرف بخشا کہ اس کی سرزمین ہمارے لیے سجدہ گاہ ہوگئی۔

آزادی کا سجدہ ایمان کی شمع اور اس سے نکلنے والی روشنی آج تمام عالم کو منوّر کر رہی ہے۔

ہمیں اپنے وطن سے محبت ہے، بلاشبہ ! لیکن اس وطن کے باسی وہ ان پرندوں سے بھی گئے گزرے ہوگئے، جن پر دروازہ کھلا تو وہ آزادی سے اُڑنے لگے اور ہم نے آج بھی قید کو گلے لگایا۔ نافرمانی، جھوٹ، دھوکا دہی، بے حیائی، مغرب کا طرزِ عمل اپنایا اور اپنی قومی زبان، ثقافتی ورثہ سب پس پشت ڈالتے ہوئے قیدی بن گئے۔ مادّہ پرستی کے قیدی، دنیا جاہِ طلبی کے قیدی یعنی کھل کر گناہ کرنے کی آزادی مل گئی۔

وہی بے راہ روی اور وہی خاموش تماشائی آنکھیں۔۔۔ کہیں سسکتی جانیں، کہیں مساجد خالی۔۔۔

لیکن جو کچھ بھی بدل چکا ہو، ایک چیز آج بھی پہلے جیسی ہے، وہ ہے ہمارا رنگ، وطن کا رنگ ! جو ہر بچے بوڑھے جوان پر دِکھائی دیتا ہے۔ مخصوص لمحوں میں جب بھی کوئی ان کے وطن پر آواز اونچی کرتا ہے تو سویا ہوا وہ جذبۂ جاں نثاری کا جاگ اٹھتا ہے کہ ہم اپنے وطن پر ایک حرف بھی برداشت نہیں کریں گے۔ ان شاءاللہ ! !

اس وطن کے سپہ سالار آج بھی کاربند ہیں، اپنے خون سے وفا کا تمغا جیتنے کے لیے۔۔۔

اور آج بھی وہ سرحدیں پُر رونق ہیں، آج بھی خون گرم جوش ہے، آج بھی جامِ شہادت کی تمنّا آنکھیں ڈھونڈتی ہیں موت کو۔۔۔ اور آج بھی کسی میں اتنا دَم نہیں کہ وہ انھیں للکارے۔

جہاں بھی بات آئے گی وطنِ عزیز کی حفاظت کی تو سر بکف لیے پھرتے ہیں، یہ عزم ہے کہ جان بھی دینا پڑی تو گریز نہیں کریں گے۔۔۔ ان شاءاللہ ! !

جانوروں کی چراگاہ پر پابندی تھی، تاکہ قدرتی توازن برقرار رہے۔ (کتاب الأموال، امام ابو عبید، ص:292)

اموی دور میں قدرتی آبی ذخائر کے تحفّظ کے لیے قوانین مرتب کیے گئے تھے، جن میں کنویں، نہریں اور چشمے عوام کے لیے وقف کیے جاتے تھے۔ (کتاب الخراج، قاسم بن سلام)

کا اسلامی متبادل تھا Protected Areas یا Wildlife Reserves یہ آج کے حضرت عمرؓ نے ریاستی سطح پر الربذہ کے علاقے کو محفوظ چراگاہ (ProtectedRange) قرار دیا، تاکہ نایاب پودوں اور جانوروں کا تحفظ ممکن ہو۔ (کتاب الأموال، امام ابو عبید، ص:292)

ماحولیاتی مسئلہ	اسلامی حل
درخت کاٹنا	درخت لگانا سنت اور صدقہ جاریہ
پانی کا ضیاع	وضو میں بھی اسراف سے بچنے کی تعلیم
آلودگی	صفائی نصف ایمان، نجاست و گندگی سے ممانعت
جانوروں کا تحفّظ	ان کے ساتھ رحم و شفقت کا حکم، ظلم سے ممانعت
فضائی آلودگی	غیر ضروری آگ جلانے، دھواں چھوڑنے سے اجتناب

مختصر یہ کہ اسلام محض عبادات کا مجموعہ نہیں بلکہ انسان اور کائنات کے مابین توازن کا ایک مکمل نظام ہے۔ ماحولیاتی بحران کو محض سائنسی مسئلہ سمجھ کر نظرانداز کرنا انسانیت کے لیے تباہ کن ہے۔ یہ اب وقت کا تقاضا ہے کہ ہم قرآن و سنت کی رہنمائی میں ماحول کو "امانت" سمجھ کر اس کی حفاظت کریں اور اپنی آنے والی نسلوں کے لیے اسے رہنے کے قابل بنائیں۔ ماحولیاتی بحران کا حل صرف سائنسی ٹیکنالوجی سے ممکن نہیں، جب تک انسان اپنی اخلاقی و روحانی سوچ تبدیل نہ کرے۔ اسلام کی فطری، متوازن اور ہم آہنگ تعلیمات اس تباہی کو روکنے کی طاقت رکھتی ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم ان تعلیمات کو صرف نصاب میں نہ رکھیں، بلکہ زندگی کا حصہ بنائیں۔ اگر ہر مسلمان اپنی ذمہ داری سمجھے تو یقیناً زمین دوبارہ "دارالسلام" بن سکتی ہے۔ اگر ہم اسلامی تعلیمات کو عملی زندگی میں اپنائیں تو نہ صرف دنیا میں امن و سکون قائم ہوگا، بلکہ قیامت کے دن ہم اللہ کے سامنے بھی سرخرو ہوں گے۔

NEW

Zaiby

Jewellers CLIFTON

A trusted name in jewellery since 1974

Create your own moment of magic

03085888455 021 35835455, 35835488

S-11, Yousuf Grand Square, Block 8, Clifton

اُمِّ محمد سلمان کی تحریر کردہ کہانی کو عنوان دیجیے۔ منتخب عنوان پر فہم دین 300 انعام دے گا، اس کہانی کا عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 15 اگست ہے۔

یہ پاک و روشن وطن ہمارا
ہماری جاں ہے ہماری جاں ہے
اسے سجا کر ہم اپنی قسمت سنوار لیں گے
جو وقت آیا تو اپنی جانیں بھی وار دیں گے
یہاں کا ہر رنگ ہر نظارہ
ہماری جاں ہے ہماری جاں ہے
یہ پاک و روشن وطن ہمارا
ہماری جاں ہے ہماری جاں ہے

سی ڈی پلیئر پر قدرے تیز آواز میں ملی نغمہ چل رہا تھا۔ بچے بہت تلاش کے بعد بغیر موسیقی والے ملی نغموں کی سی ڈی لے کر آئے تھے اور اب ساتھ ساتھ گا بھی رہے تھے اور جھنڈیاں بھی بنا رہے تھے۔ خوب پُر جوش ہو رہے تھے۔ ایک دوسرے کو چھیڑ رہے تھے، موج میلا کر رہے تھے۔ چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔ ان کا شوق دیکھنے والا تھا۔

ساری لڑیاں تیار ہو گئیں تو پھر انھیں لگانے کا مرحلہ آیا۔

جھنڈیاں لگا لی گئیں، صحن میں ہوا کے دوش پر سرسراتی ہری جھنڈیاں بہت خوب صورت لگ رہی تھیں اور جب چھت پہ جھنڈا لگانے کا مرحلہ آیا تو سارے بچے اندر کمرے سے کامران بھائی کو پکڑ لائے جو اپنی کتابوں میں سر دیے بیٹھے تھے۔

بچوں نے کامران بھائی کے ساتھ مل کر چھت کے ایک نسبتاً بلند کونے میں مضبوطی کے ساتھ جھنڈا نصب کیا۔ ہوا میں لہراتا سفید چاند ستارے والا جھنڈا اپنی بہار دِکھا رہا تھا۔

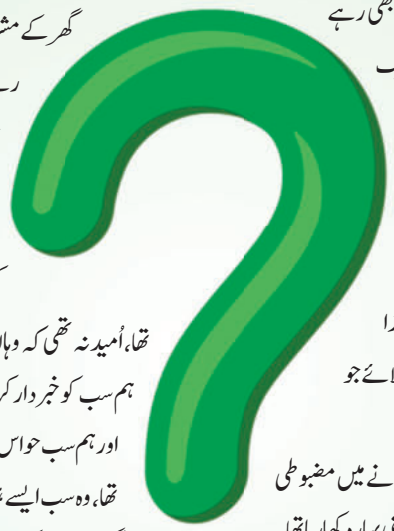

بلا عنوان

اُمِّ محمد سلمان

احسن میاں گھر میں داخل ہوئے ہی تھے کہ سامنے صحن میں سجی جھنڈیوں اور لہراتے جھنڈے پر نظر پڑی تو بے اختیار ایک طمانیت بھری آسودہ سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر پھیل گئی اور دل سے بے اختیار دعا نکلی۔

خدا کرے کہ میری ارضِ پاک پر اترے
وہ فصلِ گل جسے اندیشۂ زوال نہ ہو

آنکھیں آبدیدہ ہو گئیں، بہت دیر تک بے حس و حرکت کھڑے اس حسین منظر کو دیکھتے رہے، پھر سلام کر کے ماں جی کے تخت کی طرف بڑھ گئے۔ احسن میاں کی والدہ پچاسی سالہ ضعیف خاتون تھیں، مگر آج بھی ان کی صحت قابلِ رشک تھی۔ وہ اس عمر میں بھی بہت پھرتی سے گھر بھر کا چکر لگاتی پھرتیں، بہوؤں کو سودا سلف لا دیتیں۔ گھر کے کونے کھدروں کی صفائیاں کرواتی رہتیں۔ ہر وقت گھر میں اِک ہلچل سی مچائے رکھتی تھیں۔

مگر اس وقت وہ بھی بہت خاموش اور اُداس سی بیٹھی تھیں، نظریں وہیں سبز ہلالی پرچم پہ گڑی تھیں۔ سفید دوپٹے کے ہالے میں پُر نور چہرہ کسی اندرونی کرب کی غمازی کر رہا تھا۔ احسن میاں (جو ان کی سب سے بڑی اولاد تھے) کو دیکھ کر ہلکا سا مسکرائیں اور تخت پر ذرا سا کھسک کر ان کے لیے جگہ بنائی۔ احسن میاں جانتے تھے چودہ اگست کے آتے ہی ان کے سوئے زخم بھی ادھڑنے لگتے ہیں۔ انھوں نے تو اپنی آنکھوں سے پاکستان کو بنتے دیکھا تھا، لاکھوں لوگوں کی قربانیوں کی گواہ تھیں وہ۔ اکثر اپنی ہجرت کے قصے سنایا کرتی تھیں۔ آج بھی کچھ یوں گویا ہوئیں۔

"وہ دن مجھے آج تک یاد ہے، جب ہم بے سر و سامانی کی حالت میں انڈیا سے نکلے تھے۔ ایسا ہی ایک خوش گوار سا دن تھا۔ میں اور میری جڑواں بہن ستارہ۔۔۔ دونوں صحن میں پیپل کے درخت کے نیچے بیٹھیں اپنی دادی جان اور تائی اماں کے ساتھ کشیدہ کاری کے نئے نئے نمونے سیکھنے میں مصروف تھیں۔ دونوں چھوٹے بھائی عادل اور بلال اور چھوٹی چچی کا بیٹا حارث مل کر دالان میں اپنے اپنے میمنوں (بکری کے چھوٹے بچوں) کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ کبھی گود میں اٹھاتے، کبھی ان کے ساتھ دوڑنے لگتے۔۔۔ زندگی پورے جوبن سے اس گھر میں مسکرا رہی تھی۔ امی جان صحن کے ایک کونے میں بنے مٹی کے چولہے پر کھیر بنا رہی تھیں۔

گھر کے مشرقی حصے میں ایک بہت بڑا صحن تھا، جس میں ہمارے مویشی بندھے رہتے تھے۔ ہجرت کی خبریں آ رہی تھیں، ہم لوگ بھی ذہنی طور پہ تیار تھے کہ دو چار دن میں بس وطن چھوڑ جانا ہے اور اپنے نئے اسلامی وطن پاکستان چلے جانا ہے۔ حالات بہت خراب ہو چکے تھے۔ ہندو اور سکھ بلوائیوں نے مسلمانوں کا جینا حرام کر دیا تھا۔ آئے دن کسی نہ کسی مسلم آبادی پر حملہ کر دیتے۔ ہمارا گھر نسبتاً ایک محفوظ علاقے میں تھا، اُمید نہ تھی کہ وہاں بھی ہندو بلوائی حملہ کر دیں گے کہ اچانک گلی سے اُڑتے شور نے ہم سب کو خبردار کر دیا: حملہ ہونے والا ہے بھاگ چلو، نکلو گھروں سے، جلدی کرو۔۔۔ اور ہم سب حواس باختہ ہو گئے۔ سامان جو کب سے ساتھ لے جانے کے لیے باندھ رکھا تھا، وہ سب ایسے ہی چھوڑا، حارث اور بلال تو اپنے میمنوں کو چھوڑ ہی نہیں رہے تھے، گود میں لے کر بھاگنے کے لیے تیار تھے۔

بلال تو چلا چلا کر رونے لگا، "میں اسے ساتھ لے کر جاؤں گا، یہاں نہیں چھوڑوں گا۔۔۔ یہ مر جائے گا میرے بغیر"

امی جی نے چولہے پر پکتی کھیر کی طرف دیکھا۔ اپنی حویلی پر ایک حسرت بھری نظر ڈالی۔۔۔ اور بڑی چادر سر پہ ڈال کر ہم سب کو گھسیٹا، جو صدمے سے گنگ کھڑے تھے۔ میں نے بھی حسرت سے اپنے پیپل کے درخت سے بندھی پینگ کو دیکھا اپنی سفید گائے کو دیکھا، وہ جو چارہ بھی میرے ہاتھ سے ہی کھاتی تھی۔۔۔ کیسے رہے گی میرے بغیر؟ میرے دل میں اک پھانس سی چبھی۔

ابا جی نے جلدی جلدی مویشیوں کے رسّے کھولے کہ جہاں منہ اٹھے چلے جائیں۔ بے زبان جانور یہیں بندھے بندھے کہیں بھوک سے مر ہی نہ جائیں۔

ہم سب کل تیرہ افراد تھے جو حویلی سے نکلے۔ دادی اماں، میرے ابا جی، امی جی، تائی اماں اور تایا، چچی، چچا جان اور ان کے دو بچے، میرے دونوں بھائی اور بہن ستارہ! ہم سب اندھا دھند

بھاگ رہے تھے۔ ہمیں ایک ہفتے بعد ریل گاڑی سے پاکستان جانا تھا، مگر وائے قسمت! کس بے سروسامانی کی حالت میں ہم وہاں سے نکلے۔ راستے میں بہت دلدوز مناظر دیکھے۔ ہندوؤں نے گاؤں کے گاؤں جلادیے تھے۔ چاروں طرف خون اور لاشیں نظر آتی تھیں۔ کتنے بچوں کو ماؤں کی گود سے چھین کر بے دردی سے قتل کیا گیا، کتنی مسلمان عورتوں کی بے حرمتی کی گئی، اغوا کر لی گئیں، قتل کر دی گئیں۔ کنوئیں بھر گئے عورتوں کی لاشوں سے،،، کتنی ہی باعصمت بیٹیوں نے ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں رسوا ہونے کے خوف سے کنوؤں میں چھلانگ لگا دی۔ اپنے ہاتھوں خود کو خنجر مار لیے۔ وہ کیسی رونگٹے کھڑے کر دینے والی داستانیں تھیں۔

ہم تیرہ افراد گھر سے نکلے تھے اور واہگہ بارڈر پہ پہنچتے پہنچتے صرف چھ افراد بچے تھے۔ نہ پوچھو۔۔۔؟ ہم نے کیا قیامت کا سماں دیکھا تھا۔ یاد آتا ہے تو آج بھی دل لرزتا ہے۔ زبان میں طاقت نہیں جو اس وقت کی وحشت اور بربریت کو بیان کر سکے۔

میری بہن ستارہ کو اتنے زخم آئے حملوں میں کہ وہ راستے ہی میں چل بسی۔ میرے بھائیوں بلال اور عادل کا کچھ پتا نہیں چلا۔ جب ایک رات ہم ایک مال گاڑی میں سوار تھے اور اس پر حملہ ہو گیا۔۔۔ نہ جانے وہ اغوا کر لیے گئے یا مار دیے گئے۔

ماں جی اپنے بھائیوں کو یاد کر کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں اور میری جوان خوب صورت چچی کو راستے میں سے ہندو بھیڑیے گھسیٹ کر لے جانے لگے، چچا اور تایا نے دیوانہ وار ان لوگوں پر حملہ کر دیا۔۔۔ اور وہ چچی جان کو نہ لے جا سکے تو ان کے سینے میں خنجر گھونپ دیا اور بھاگ گئے۔ چچا جان بھی ان کی برچھیوں کے وار سے نہ بچ سکے اور وہیں چچی جان کے ساتھ زندگی کی آخری سانسیں لیتے ہوئے اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔

کیا بتاؤں تمہیں احسن؟ ہم کیسے اجڑ کر یہاں پہنچے۔ ہم نے کیمپوں میں کیسے دن رات گزارے؟ ماں جی بے تحاشا رو رہی تھیں اپنے پیاروں کو یاد کر کے۔ جس علاقے میں ہمیں گھر ملا تھا، بہت سنسان سا تھا۔ کئی گھر غیر آباد پڑے تھے، ایسا ہُو کا عالم طاری رہتا تھا کہ دن میں بھی ڈر لگتا۔ حالات وواقعات کے ایسے ستائے ہوئے تھے کہ اپنے سایوں سے بھی خوف کھاتے تھے۔ اپنا بھرا پُرا گھر، مال مویشی، لہلہاتے کھیت، گھر کا کنواں، پیپل کا درخت اور میری ہم نشیں، ہم راز میری بہن ستارہ جہاں! میرے بچھڑے بھائی، میری چچی جان اور شفیق چچا! کیا کیا نہ گنوایا تھا۔ کیا کیا یاد نہ آتا تھا؟

ماں جی ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں اور احسن میاں بھی کب تک خود پر قابو رکھتے، بے اختیار آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ماں جی کو گلے لگا لیا، تسلی دینے لگے۔

بچے بھی سب اپنے مشاغل چھوڑ کر دادی اماں کے پاس جمع ہو گئے۔ سب کے سب آبدیدہ تھے۔ وہ کیسے اپنی دادی ماں کے غموں کا مداوا کرتے، اے کاش! وہ کہیں سے ان کے بھائیوں کو ڈھونڈ کر لا سکتے۔ مرے ہوؤں کو صبر کرنا آسان ہوتا ہے، مگر جو زندہ بچھڑ جائیں، ان کا غم تو جیتے جی مار دیتا ہے۔

دوسرا دن طلوع ہو گیا، یہ آزادی کی صبح تھی۔ چودہ اگست کا روشن دن طلوع ہو چکا تھا۔ گھر کے بچوں اور بڑوں سب نے مل کر پروگرام میں حصہ لیا۔ آج کوئی پیچھے نہیں ہٹے گا۔

سب نے فجر کی نماز ادا کی، تلاوت کی اور ناشتے کے بعد صحن میں جمع ہو گئے۔ پاکستان اور تاریخِ اسلام کے حوالے سے کوئز کا مقابلہ رکھا گیا۔ ملی نغموں کا مقابلہ ہوا، جس میں بچوں اور بڑوں نے بھرپور شرکت کی۔

ہر چھوٹے بڑے نے پاکستان سے اپنے جذبہ حبُّ الوطنی کے اظہار کے لیے ایک ایک جملہ کہا۔ ننّھے منّے سے چھ سالہ وقاص سے جب پوچھا گیا: ”آپ پاکستان کے لیے کیا کریں گے؟“ تو وہ بہت جوش سے بولا: ”میں فوجی بنوں گا، دشمن سے لڑوں گا۔۔۔ اور میں کبھی امی سے چھپ چھپ کے سیف کے گھر جا کر دشمن ملک کے کارٹون نہیں دیکھوں گا۔۔۔“ اور سب گھر والے اس کے برجستہ انداز پر ہنسنے لگے۔

نعمان کی باری آئی، اس سے پوچھا گیا: ”آپ وطن کے لیے کیا کریں گے؟“ تو نعمان میاں بڑی بردباری سے گویا ہوئے: ”میں اور میرے چند دوست کل اسکول سے آنے کے بعد اپنی مہم کا آغاز کریں گے اور وہ یہ کہ ہم سب مل کر گلی محلوں اور سڑکوں پر گری ہوئی جھنڈیاں اٹھا کر جمع کریں گے، تاکہ میرے ملک کے پرچم کی پامالی نہ ہو۔“

اور اس بات پر سب نے نعمان کی حوصلہ افزائی کے لیے خوشی کا اظہار کیا۔ کامران بھائی بھی اپنا جذبہ حبُّ الوطنی لے کر میدان میں اترے اور بڑے جوش وجذبے کے ساتھ گویا ہوئے: ”میں اپنے وطن کو صاف ستھرا رکھنے کے لیے چند عملی اقدامات ترتیب دوں گا، جن پر ہم سب عمل پیرا ہوں گے ان شاء اللہ! اور انہی میں ہماری ایک اسکیم درخت لگانا بھی ہے۔“

خنساء نے اپنی خوب صورت آواز میں ملی نغمہ سنایا، سب لوگ اس کی آواز کے سحر میں کھو گئے۔

روشن میری آنکھوں میں وفا کے جو دیے ہیں
سب تیرے لیے ہیں، اے وطن تیرے لیے ہیں

سب کی آنکھیں نم تھیں، تقریب اپنے اختتام کو پہنچی۔ آخر میں احسن میاں نے ایک چھوٹی سی، مگر پُرجوش تقریر کی۔

پیارے بچو! یہ وطن ہم نے ایک عظیم مقصد کے تحت حاصل کیا تھا، تاکہ ہم اپنے دین کے سنہری اصولوں کے مطابق اپنی زندگی گزار سکیں اور اس خطۂ ارضی کو مثلِ مدینہ بنا سکیں۔

میرے بچو! آپ لوگ اپنے فرض سے غافل نہ ہو جانا، روپے پیسے اور جاہ ومنصب کی دوڑ میں کبھی شامل نہ ہونا، اپنے اسلامی تشخّص کو برقرار رکھتے ہوئے ہمیشہ اس ملک کی تعمیر وترقی کے لیے کوشاں رہنا۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا، وسائل کو بروئے کار لانا، انتھک محنت اور جدوجہد سے ہمیشہ اپنے ملک وملت کی خدمت کرتے رہنا۔ کبھی یہ نہ سوچنا اس ملک نے ہمیں کیا دیا؟ بلکہ ہمیشہ یہ سوچ رکھنا کہ آپ نے اپنے پیارے وطن کو کیا دیا؟ آپ اس کے لیے کیا کر پائے؟ کیا آپ اللہ کے اس احسان کا بدلہ چکا پائے ہیں؟

میرے بچو! اپنے آپ کو ہمیشہ محبوبِ کبریا محمدِ مصطفیٰ ﷺ کی غلامی میں رکھنا۔ یہی غلامی ہمارا فخر اور ہمارے سر کا تاج ہے۔

یاد رکھنا۔۔۔

محمدؐ کی غلامی دینِ حق کی شرطِ اوّل ہے
اگر ہو اس میں کچھ خامی تو سب کچھ نامکمل ہے

احسن میاں خاموش ہوئے تو سب نے پُرجوش انداز میں تالیاں بجا کر اپنے پُرمسرّت جذبات کا اظہار کیا۔ دادی ماں اپنے گھر کے بڑے سے صحن میں اپنے بچوں کے خوشیوں سے تمتماتے چہروں کو سکون واطمینان سے دیکھ رہی تھیں۔ دل اندر ہی اندر رب کے حضور سجدہ ریز تھا کہ لاکھوں جانوں کی قربانیاں رنگ لائی ہیں اور آج ہماری نسلیں آزاد وطن میں سانس لے رہی ہیں۔

یومِ آزادی

انیسہ عائش

انمول نے ایک طائرانہ نظر اپنے ارد گرد دوڑائی۔ اس کی آنکھوں میں واضح حیرت تھی۔ یہ سب اس کے لیے بالکل نیا اور انوکھا تھا۔ کالج کے پلے گراؤنڈ ایریا میں اسٹیج بنایا گیا تھا، جس پر یومِ آزادی کے حوالے سے آرائش کی گئی تھی۔ سب بچیاں سفید یونیفارم اور سبز دوپٹے میں چودہ اگست کی مناسبت سے ملبوس تھیں۔ آج کالج انتظامیہ کی طرف سے چودہ اگست کے حوالے سے تقریب منعقد کروائی گئی تھی۔ تقریب کا آغاز کیک کاٹنے سے ہوا۔ اسٹیج کے وسط میں بڑی سی میز پر کیک رکھا گیا تھا، جس پر سبز کریم سے جلی حروف میں "ہیپی برتھ ڈے پاکستان" لکھا ہوا تھا۔ تالیوں کی گونج میں کیک کاٹا گیا۔ اس کے بعد بچیوں نے ٹیبلو پیش کیے۔ کچھ نے ملی نغمے گائے۔ جلد ہی تقریب اختتام پذیر ہو گئی۔ لڑکیوں کی اکثریت نے کینٹین ایریا کا رُخ کیا۔ آج یہاں بھی بہار اتری ہوئی تھی۔ معمول سے زیادہ آئٹمز موجود تھے۔ انمول اور اس کی دوست اپنے منگوائے گئے آرڈر کے ساتھ انصاف کرنے میں مشغول تھیں کہ دو لڑکیاں آئیں اور سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی کا ہاتھ تھام کر بولیں: "آؤ بیسمنٹ میں چلتے ہیں، جلدی کرو۔" ان کو دیکھ کر وہ دونوں بھی متجسس سی پیچھے پیچھے چلی آئیں۔ بیسمنٹ کے دروازے پر گلابی چارٹ پر غباروں کے ہالے میں "Fun Gala" لکھا ہوا تھا۔ اندر داخل ہوئے تو وہاں ایک عارضی اسٹیج بنایا گیا تھا۔ اس اسٹیج پر بچیاں ڈانس کر رہی تھیں۔ دو ہیڈ گرلز لڑکیوں کی نگرانی پر معمور تھیں کہ کوئی موبائل وغیرہ نکال کر ویڈیو نہ بنا پائے تو دو دروازے پر استادہ تھیں کہ غیر متعلقہ لڑکیاں داخل نہ ہوں پائیں۔ کچھ دیر یہی ہلا گلا چلتا رہا۔ آخر میں اسپیکر سے آواز سنائی دی۔ "گرلز ہو جائیں تیار! آئٹم سونگ پر ڈانس کرنے کے لیے آ رہی ہے ماہا علی۔۔۔" یہ سنتے ہی ہا، ہو کا شور مچ گیا۔ یہ لڑکی ہر فنکشن کے لیے اپنی کارکردگی کی وجہ سے مشہور تھی، سو عوام میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اگلے ہی لمحے تالیوں اور سیٹیوں کی گونج میں ماہا علی کا شو شروع ہو چکا تھا۔ اس وقت جبکہ سب لڑکیوں پر جوش طاری تھا، انمول کا دل یکایک گھبرا اُٹھا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ بے چین سی دروازے کی طرف بڑھی۔ شور میں اس نے ہاتھ سے طبیعت خرابی کا اشارہ کیا اور دروازے سے نکلتی چلی آئی۔ وہ چھٹی کے بعد وین میں بھی خاموش بیٹھی رہی جبکہ اس کی دوست زور شور سے تبصرے کر رہی تھی۔ رستے میں بھی باجوں اور پٹاخوں کا شور تھا۔ گھر آ کر وہ خاموشی سے اپنے کمرے کی طرف چل دی۔

"انمول کدھر ہے؟" خضر چاچا نے پوچھا۔

انمول ان کی بڑی بھتیجی تھی۔ گھر بھر کی لاڈلی، گھر کا پہلا بچہ ہونے کی وجہ سے سب سے زیادہ ان کے قریب تھی اور اس کے سب سے زیادہ لاڈ پیار انھوں نے ہی اٹھائے تھے۔ وہ گھر بھر کی رونق تھی۔ آج سب بچے جمع تھے۔ ایسے موقع پر وہ بچہ پارٹی کی سربراہ بنی نظر آتی تھی۔ وہ اس کے کمرے میں دستک دے کر اندر داخل ہوئے تو اسے سامنے سوچوں میں گھرے ہوئے بیٹھا پایا۔

"خیر ہے، کیا ہوا ہماری چھوٹی انمول کو؟" اپنی سوچوں سے لڑتی ہوئی انمول نے بالآخر چاچو سے اپنی الجھن شیئر کرنے کا سوچا۔

"چاچو! ہم 14 اگست کیوں مناتے ہیں؟" انھوں نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ اتنا سادہ سا سوال نہیں معلوم۔ پھر اس کے چہرے پر واضح اُلجھن دیکھ کر وہ اس کی طرف مکمل طور پر متوجہ ہو گئے۔ "کیوں کہ اس دن پاکستان آزاد ہوا تھا۔" انمول نے فوراً سے اگلا سوال کیا۔

"پاکستان آزاد کیوں ہوا تھا؟"

"اس لیے کہ ہندوستان میں دو قومیں آباد تھیں، ہندو اور مسلمان۔ دونوں کا رہن سہن، مذہب، لباس، مزاج، ہر چیز الگ الگ تھی۔ اس لیے مسلمان چاہتے تھے کہ ان کے پاس الگ ملک ہو، جہاں وہ آزادی سے اپنے دین پر عمل کر سکیں، انھیں کوئی روک ٹوک نہ ہو، کوئی حقارت سے دیکھنے والا نہ ہو۔"

"اور چاچو ہم یہ کیوں کہتے ہیں: "پاکستان کا مقصد کیا؟ لا الہ الا اللہ؟"

جواباً چاچا جان بولے: "اس کا معنی ہے کہ پاکستان اسلام کے نام پر بنا اور یہاں پر مکمل طور پر اسلامی نظام ہو گا، یہاں حکمرانی اللہ تعالیٰ کے لیے ہو گی۔ رہن سہن، لباس، مزاج، روایات سب اسلام کے مطابق ہوں گی۔"

"لیکن چاچو! ہم تو اس کے الٹ چلتے ہیں۔ ہم ہندوؤں جیسی رسمیں کرتے ان کے جیسی سوچ رکھتے ہیں، ان کی طرح گانے سنتے، ڈانس کرتے ہیں اور ان کو فالو بھی کرتے ہیں۔ ایسا کیوں؟"

اس سوال پر چاچا جان نے گہری سانس بھری۔ "بیٹا! اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم آزاد ہو کر بھی ذہنی طور پر غلام ہیں۔ یہ ہماری سوچ ہے جو ابھی آزاد نہیں ہو سکی۔ تبھی ہم ان کے طریقوں کو اپناتے ہیں۔ آہستہ آہستہ ہم اپنی روایات کو بھولتے جا رہے ہیں اور اس مقصد کو بھی جس کے لیے پاکستان آزاد ہوا تھا۔ اس کا اندازہ یہاں سے ہی لگا لو کہ ہمارے دور میں 14 اگست مختلف ہوا کرتا تھا۔ ہمیں اس دن کا بہت انتظار ہوا کرتا تھا۔ اگست کا مہینہ شروع ہوتے ہی ہر طرف ملی نغموں کی صدائیں گونجنا شروع ہو جاتی تھیں۔ اس وقت ہمارے گھر کے بڑے، بزرگ بچوں کو اکٹھا کر کے قربانی کی داستانیں سنایا کرتے تھے۔ اسکول، کالجوں اور تعلیمی اداروں میں یومِ آزادی کی تقریبات کا پُرجوش اہتمام کیا جاتا تھا۔ ان تقاریب میں ملی نغمے، تقاریر اور اس سے متعلق مختلف پروگرام ہوا کرتے تھے۔ ان دنوں میں حبُ الوطنی کا جذبہ اتنا بھر جایا کرتا تھا کہ یہ پورا سال کام آتا۔ شکرانے کے نوافل پڑھے جاتے، کچھ میٹھا بنایا جاتا، ہم میوزیم دیکھنے جاتے۔ وہاں ہجرت کے مناظر اور یادگاریں ہمیں یاد دلاتیں کہ آزادی کے لیے ہمارے بڑوں نے کس طرح قربانیاں دیں، جبکہ آج کل وہ جذبہ دِکھائی نہیں دیتا۔ تقاریب تو ہوتی ہیں، مگر خانہ پُری۔۔۔ کیک کاٹنا، رقص، تصویر کشی ملبوسات پہننا۔ جلوس اور ریلیاں نکالی جاتی ہیں۔ بچے پٹاخے اور باجوں کے سُر نکالتے ہیں، نوجوان موٹر سائیکلوں کے سائلنسر نکال کر جشنِ آزادی مناتے ہیں۔ اس سب میں حبُ الوطنی کا جذبہ کہیں پیچھے رہ جاتا ہے۔ یہ سب ایک رسم بن کر رہ گیا ہے۔ یہ سب دیکھ کر خوشی کی بجائے افسوس زیادہ ہوتا ہے۔" چاچا جان سانس لینے کو رُکے تو ان کی بات دھیان سے سنتی انمول بول اٹھی: "چاچا جان! یومِ آزادی کے دن کو منانے کا اصل مقصد کیا ہوتا ہے؟"

"بیٹا! یومِ آزادی کا دن ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ہم آزادی جیسی نعمت پر شکر ادا کریں۔ اِس دن اُن مہاجرین اور شہدا کو خراجِ تحسین پیش کریں، جن کی بے مثال قربانیوں سے ہمیں یہ وطن ملا۔ اس دن ہم ہجرت کی کہانیوں اور خونی داستانوں کو دہرائیں جو ہم بھلا چکے۔ یہ ہمیں یاد دلائیں گی کہ پاکستان کس لیے بنایا گیا۔"

اور ہم خود سے وعدہ کریں کہ ہم اس کے اصل مقصد سے پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ اپنے حبُ الوطنی کے جذبے کو جگائیں کہ ہم اس وطن کے لیے جان کا نذرانہ تک پیش کرنے کے لیے تیار رہیں گے۔ یہ الفاظ کہتے ہوئے چاچا جان کی آواز بھرّا گئی۔ ان کی زبان سے نکلا ایک ایک لفظ انمول کے دل میں اترتا جا رہا تھا۔ اس کے ذہن کی ساری گرہیں کھل چکی تھیں۔ اسے آج یومِ آزادی کا اصل مقصد سمجھ آ چکا تھا۔۔۔!!

بیت السلام لیبارٹری اینڈ ڈائیگناسٹک سینٹر

BAITUSSALAM

مستحقین زکوۃ کیلئے مفت ٹیسٹ کی سہولت

خدمت، عزت اور احترام کے ساتھ

اپنی نوعیت کی منفرد اور معیاری لیبارٹری

- او پی ڈی
- ایکسرے
- الٹراساؤنڈ

اور تمام اقسام کے تشخیصی ٹیسٹ دستیاب ہیں

- ہیماٹولوجی
- کیمیکل پیتھالوجی
- مائکروبایولوجی
- مالیکیولر پیتھالوجی/پی سی آر
- امیونولوجی اور سیرولوجی

مناسب قیمتوں میں

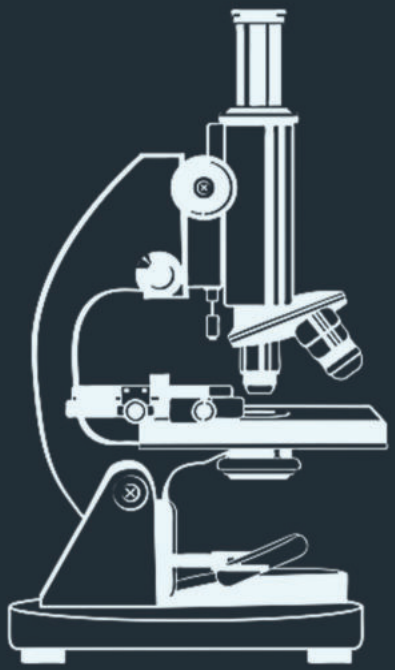

برائے رابطہ

+92 21 35392634

+92 334 2982988

lab@baitussalam.org

شوروم نمبر 01، گراؤنڈ فلور، رائل ٹاورز
مین کورنگی روڈ، نزد قیوم آباد چورنگی
PSO پمپ سے متصل کراچی۔

”وہ سامنے مضبوط بنیادوں پہ قائم، دیو قامت قلعہ نظر آرہا ہے؟“ انگلی کا اشارہ کیا گیا۔

”ہاں! لیکن تم مجھے کیوں دکھا رہے ہو؟ اس میں کوئی خاص بات ہے؟“ گہری نظروں سے تکتے ہوئے پوچھا گیا۔

”اسے دھیان سے دیکھو! اس کی اینٹوں سے جڑا سیمنٹ کتنا سُرخ ہے۔ جانتے ہو کیوں؟“ اس کی آواز کسی کنویں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

”کیوں؟؟“ نہ سمجھی سے پوچھا گیا۔

”کیوں کہ اس کی ہر اکائی کو جوڑنے کے لیے خون استعمال کیا گیا ہے، ستونوں کی جگہ انسانی جسم ایستادہ ہیں، غور کرو! دیواروں میں پتھروں کی بجائے سر چنے گئے ہیں۔“ پُراسرار انداز میں بتایا گیا۔

”یہ بہت خوف ناک ہے اس کے پاس جاتے ہوئے ہر کوئی گھبراتا ہوگا“ جھرجھری لے کر کہا گیا۔

”بالکل! کوئی اسے ٹیڑھی آنکھ سے دیکھ بھی نہیں سکتا۔ اس کی طرف بڑھتے قدم لرزتے ہیں۔ اس کے خلاف سازش کرنے والے کپکپا جاتے ہیں۔“ مضبوط اور پُرعزم لہجے میں بتایا گیا۔

”یہ وجود میں کیسے آیا؟“ دل میں مچلتے سوال نے لفظوں کا روپ دھارا۔

”سنو!۔۔۔“ سرگوشیاں سناٹوں کے سینے چیرنے لگیں۔

مارچ 1947

”بیٹا! سننے میں آیا ہے کہ کانگرسی اور اکالی کے رہنماؤں کی لاہور میں کی گئی تقریروں کے بعد، جالندھر اور آس پاس کے علاقوں میں فسادات پھوٹ پڑے ہیں۔“ چاچا گھلانے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے رازداری سے کہا۔

”جی چاچا! میں نے بھی ریڈیو پر سنا ہے۔“ خوشی محمد نے ان کی باتوں کی تصدیق کی۔

”یہ باتیں گھر کی عورتوں تک نہیں پہنچنی چاہیے، خواہ مخواہ پریشان ہوں گی۔“ چاچا خیراتی نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

”اللہ کا شکر ہے، ہمارا گاؤں ”مہر پور“ محفوظ ہے۔“ خوشی محمد نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”لیکن گاؤں کے ماحول میں ایک عجیب خاموشی سی طاری ہو چکی ہے۔“ خوشی محمد کے والد نظام الدّین نے اپنے احساسات بیان کیے۔

ایک بڑی حویلی میں 40 کے قریب لوگ مل جل کر رہتے تھے، جس میں خوشی محمد کے ماں باپ، بہن بھائی، دو چچا، ان کے بیوی بچے، والد کے چچازاد بھائی اور ان کے اہل وعیال شامل تھے۔

3 جون 1947 کو باقاعدہ ہندوستان کی تقسیم کا اعلان ہوا۔ اس اعلان کے تحت برِّصغیر کو دو حصوں میں تقسیم کیا جانا تھا۔ اس کے بعد دہلی اور پنجاب کے مختلف حصوں میں فسادات کا دائرہ بڑھنے لگا، جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی، وہ علاقے محفوظ تھے۔ مہر پور میں ہندو، سکھ اور مسلمان تینوں قومیں آباد تھیں۔ یہاں کی فضا میں کشیدگی صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔ مسلمان ہر وقت چوکنے رہتے۔ پہرے کا خاص اہتمام کیا جاتا۔ آس پاس کے علاقوں سے بلوائیوں کی خبریں آتی رہتی تھیں۔ فسادات شدّت پکڑنے لگے۔ 14 اگست 1947 کو قیامِ پاکستان کا اعلان ہوتے ہی، جو خاندان ہجرت نہیں کرنا چاہتے تھے، وہ بھی اپنے گھر چھوڑنے پر مجبور ہوگئے۔ ان دنوں خوشی محمد ایک سکھ استاد کے پاس بڑھئی کا کام کرتے تھے۔

”قتل وغارت گری عروج پر آ پہنچی ہے، اب ہمیں بھی اپنی زمین کو خیر آباد کہنا پڑے گا۔“ خوشی محمد کے چچا خیراتی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

یہ مغرب کے بعد کا وقت تھا۔ پورا خاندان ایک بڑے کمرے میں جمع تھا۔

وقت فیصلہ کن لمحے میں داخل ہو چکا تھا۔ بچے ماؤں کے پہلوؤں میں دبکے ہوئے تھے۔

”یہ فیصلہ ہمیں آج ہی کرنا ہوگا۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ بہتر ہوگا کل صبح فجر سے پہلے گاؤں چھوڑ دیا جائے۔“ خوشی محمد کے والد نے دل کی بات کہی۔ سب ہی ان سے متفق تھے۔ وہ لوگ کافی وقت سے آہستہ آہستہ ہجرت کی تیاری کر رہے تھے۔

”بھائی! چال باز سکھوں کا کوئی بھروسا نہیں ہے کہ کب حملہ کر ڈالیں۔ آپ گھر پر خواتین اور بچوں کے پاس ٹھہریں۔ میں اور خیراتی گھر کے دروازے کو باہر سے تالا لگا کر کھیتوں میں چلے جائیں گے، تاکہ اگر حملہ آور آئیں بھی تو باہر سے کواڑ بند دیکھ کر حویلی خالی سمجھ کر لوٹ جائیں۔ ہم دونوں صبح فجر سے پہلے واپس آکر آپ لوگوں کے ہم راہ پاکستان کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔“ گھلانے تفصیل سے منصوبہ بیان کیا اور سب گھر والے اس پر متفق ہوگئے۔

رات کا آخری پہر تھا۔ جب بلوائی حویلی کی دیواریں پھلانگ کر برچھیاں اور کرپانیں لہراتے حملہ آور ہوئے۔ انھوں نے داخلی دروازے کا تالا بھی توڑ ڈالا تھا۔ یہ تقریباً 20 افراد پر مشتمل جتھا تھا۔

”مارو! ان مُسلوں کو کوئی بچنے نہ پائے“ وہ شور مچاتے، نعرے لگاتے ہر جانب پھیل رہے تھے۔

گھر کے مردوں نے حتّی المقدور مقابلہ کرنے کی کوشش کی، مگر دشمنوں کی تعداد کے سامنے زیادہ دیر ٹھہر نہ سکے۔ ایک کے بعد ایک شہید ہونے لگا۔ وہ آزادی کی قیمت اپنے خون سے ادا کرتے، کٹ رہے تھے۔

”پاکستان زندہ باد! لاالہ الااللہ محمد رسول اللہ“ خوشی محمد کے والد کی زبان سے یہ کلمات ادا ہوئے اور وہ ان کافروں سے مقابلہ کرتے ہوئے نیچے گر پڑے۔ شیطان کے ہرکاروں پر خون سوار تھا۔ وہ پورے گھر میں دندناتے پھر رہے تھے۔ خواتین نے ہنگامے کی آوازیں سن کے اپنے بچوں اور لڑکیوں کو اِدھر اُدھر چھپا دیا۔

”اس گھر میں بچے بھی ہیں اور عورتیں بھی۔۔۔ ڈھونڈو ان کو، ایک بھی بچنے نہ پائے۔“ ایک لمبے قد کا آدمی جس نے سر پہ پگڑی باندھی ہوئی تھی، برچھی گھماتے بولا۔

ماؤں کے سامنے شیر خواروں کے سینوں میں کرپانیں اتار دی گئیں۔ وہ اپنے ہاتھ منہ پر رکھے چیخوں کے گلے گھونٹ رہی تھیں۔ سب لہو میں نہلا دیے گئے۔ خواتین کو بھی ابدی نیند سلا دیا گیا۔ حویلی میں کوئی ذی روح باقی نہیں بچا۔

بقیہ صفحہ نمبر 26 پر

”خیراتی! فجر میں تھوڑا ہی وقت باقی ہے، اب ہمیں چلنا

قلعہ سُرخ

شمائلہ شکیل

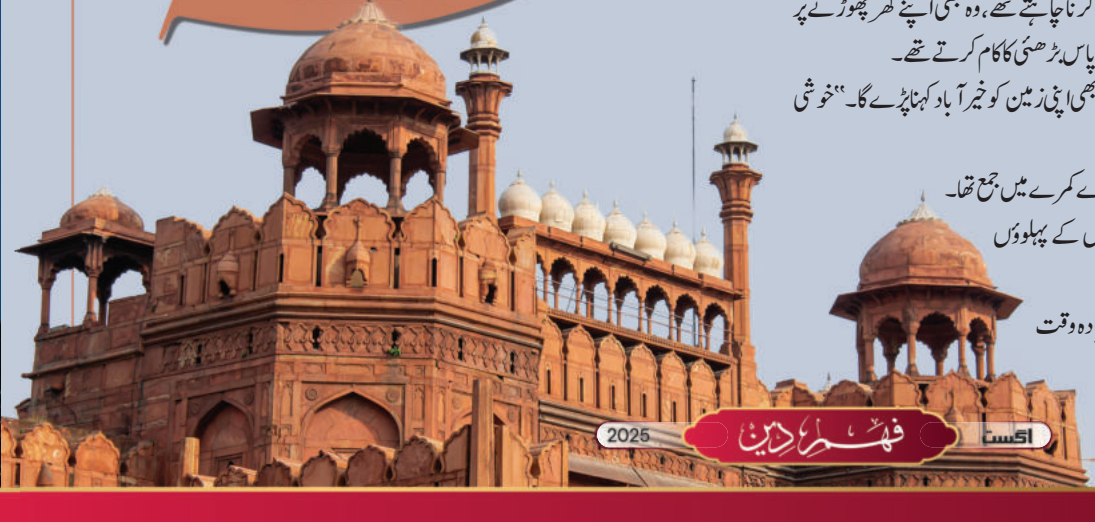

کچھ خوف ناک مناظر

میمونہ عظیم

موسمِ گرما اور پھر جون جولائی کے ایّام سندھ کے گرم علاقوں میں گھر آتش فشاں کے مثل لگتے ہیں، تب وہ آتشِ جہنم بہت یاد آتی ہے اور دل میں اپنی بد اعمالیوں کے باعث انجامِ بد سے ڈرتے ہوئے ٹیس اٹھتی ہے اور عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

ہائے! وہ کٹھن لمحے کہ جب سورج سروں پر معلق ہو جائے گا۔۔۔

ہائے! وہ گرمئ سورج اور تپشِ آتش جو دور سے ہی جھلسا کر خاکستر کر دے۔۔۔

ہائے! وہ مشکل گھڑیاں کہ جو اپنے اعمالِ بد کے بقدر پسینے میں شرابور کر دیں گی۔۔۔

ہائے وہ پھر میدانِ محشر کی گرمی کہ جب ہر صالح و فاجر، سعید و شقی، حساب و کتاب شروع ہونے کے انتظار میں ہو گا۔۔۔

ہائے! وہ انبیا کی کپکپاہٹ اور رحمانی جلال و رعنائی بھری کیفیت۔۔۔

ہائے وہ نفسی نفسی کا عالم کہ جب مجنوں کو بھی لیلیٰ بھول جائے گی۔۔۔

ہائے وہ وقت کہ جب انبیا علیہم السّلام بھی تھر تھر کانپیں گے اور عیسیٰ علیہ السلام والدہ ماجدہ بھول جائیں گے۔۔۔

ہائے! پھر اسی اثنا کافر کی صدا یٰلَیۡتَنِیۡ کُنۡتُ تُرٰبًا اے کاش میں مٹی ہو جاتا۔

ہائے! وہ خواص و عوام کے جھرمٹ کے مابین اچانک جہنم کا لایا جانا کہ جس کی ستر سال کی مسافت سے ہی جسم جھلسا دے۔۔۔

ہائے! وہ جہنم کا بے باکی سے بنی آدم کو کھا لینے کی کوشش پھر فرشتوں کا لگام ڈال کر روکنا۔۔۔

صحیح مسلم میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے: "جہنم کو اس دن لایا جائے گا، اس کے ساتھ ستر ہزار لگامیں ہوں گی، ہر لگام کو ستر ہزار فرشتے کھینچ رہے ہوں گے۔"

ہائے! کھال جھلسنے کے بعد وہ دوبارہ کھال کا چڑھ جانا۔

ارشادِ باری ہے: كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُم بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا (النساء: 56)

"جب ان کی کھالیں جل جائیں گی تو ہم ان کے بدلے نئی کھالیں چڑھا دیں گے، تاکہ وہ عذاب چکھتے رہیں۔"

ہائے! جہنمیوں کی وہ ذلت و خواری کی الگ آگ جو سینے میں لگی ہو گی۔۔۔

ہائے! وہ موت کو دنبے کی شکل میں لا کر اہلِ جہنم کے سامنے ذبح کرنے کے وقت کا کرب والم۔

ارشادِ نبوی ﷺ ہے: "قیامت کے دن موت کو ایک مینڈھے کی صورت میں لایا جائے گا اور جنت و جہنم والوں کے درمیان ذبح کر دیا جائے گا۔"

پھر کہا جائے گا: "اے جنت والو! ہمیشہ جنت ہے۔ اے جہنم والو! ہمیشہ جہنم ہے۔"

ہائے! وہ اہلِ جہنم کی پکار کہ جب کوئی سننے والا نہ ہو گا۔۔۔

ہائے! وہ پکار کہ جس کو زفیر و شہیق سے تعبیر کیا گیا۔۔۔

ارشادِ باری ہے: إِذَا رَأَتْهُم مِّن مَّكَانٍ بَعِيدٍ سَمِعُوا لَهَا تَغَيُّظًا وَزَفِيرًا (الفرقان: 12)

"جب وہ (جہنم) انھیں دور سے دیکھے گی، وہ اس کا غضب اور چیخ پکار سنیں گے۔"

ہائے! وہ ندا کہ جب اہلِ جہنم کی پکار پر ہزار برس بعد داروغۂ جہنم جواب دے گا۔۔۔

ہائے! وہ مالک (داروغۂ جہنم) کا بھی تأسف زدہ جملہ کہ عذاب ہی تمہارا مقدر ہے۔

ارشادِ باری ہے: وَنَادَوْا يَا مَالِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ قَالَ إِنَّكُم مَّاكِثُونَ (الزخرف: 77)

"اور وہ (جہنمی) پکاریں گے: اے مالک! تیرا رب ہمارا کام ہی تمام کر دے (یعنی ہمیں موت دے دے)، وہ کہے گا: تمھیں ہمیشہ اسی (عذاب) میں رہنا ہے۔"

ہائے! وہ رحمٰن رب کا اچانک بابِ رحمت بند کرنا۔۔۔

ہائے! وہ اہلِ جہنم کی زبانوں پر یک دَم قفل لگ جانا اور وہ اعضائے جسمانی کی قوّتِ گویائی۔۔۔

اَلۡیَوۡمَ نَخۡتِمُ عَلٰۤی اَفۡوَاهِهِمۡ وَتُکَلِّمُنَاۤ اَیۡدِیۡهِمۡ وَتَشۡهَدُ اَرۡجُلُهُمۡ بِمَا کَانُوۡا یَکۡسِبُوۡنَ (یٰسین: 65)

"آج ہم ان کے منہ پر مہر لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے بات کریں گے اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے، ان اعمال کی جو وہ کرتے رہے۔"

ہائے میرے اللہ! وہ درد و تکلیف کہ جب زبانیں بھی درد و کیف کے بیاں سے عاری ہو جائیں۔۔۔

اللہ اللہ! کیا ہی جان لیوا مناظر ہیں، جن کی قرآن و حدیث میں عکاسی کی گئی ہے۔۔۔۔

پھر وہ لمحات کہ جب انبیا بھی اپنی امتوں کے خلاف گواہی دیں گے۔۔۔

ہائے! وہ وقت کہ جب نبی آخر الزماں ﷺ کی زبان بول اٹھے گی۔۔۔

"اللہ میری اس قوم نے قرآن کو (سجا کر بس پڑھنا اور عمل کرنا) چھوڑ دیا تھا۔"

سورۃ الفرقان میں اللہ جلّ شانہ فرماتے ہیں:

وَقَالَ الرَّسُولُ يَا رَبِّ إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هَٰذَا الْقُرْآنَ مَهْجُورًا

"اور رسول کہیں گے: اے میرے رب! میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑ دیا تھا۔"

ہائے! وہ وقت کہ جب جنتی اپنے جہنمی دوستوں کو جہنم میں دیکھیں گے۔۔۔

ہائے! وہ وقت کہ جب چہرے شرم کے مارے جھک جائیں گے۔۔۔

ہائے! وہ وقت کہ جب چھپنے کی نہ جگہ ہو گی اور نہ کوئی پناہ گاہ۔۔۔

ہائے! وہ وقت کہ جب مبلغین جہنمیوں پر حیرت کا اظہار کیا جائے گا۔۔۔

ہائے! اہلِ جہنم کا وہ جملہ کہ جب کہیں گے: "ہم صرف کہا کرتے تھے، خود عمل نہیں کرتے تھے۔"

پھر وہ وقت کہ جب باقی اعذار ایک طرف، بے نمازیوں کی پکڑ ہو گی۔۔۔

ہائے! وہ اہلِ جہنم کا بے چارو ناچار جرم کا اظہار و اعتراف کرنا:

قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ (المدثر: 43)

اور ہمارا یہ گناہ بھی ہمیں ہلاک کرنے کے لیے کافی ہے کہ "ہم نماز نہیں پڑھا کرتے تھے۔"

کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ ہم اللہ کی جانب رجوع کریں؟

کیا اب بھی اللہ کے احکام توڑ کر اپنی من مانی کر کے ہم خوش رہ سکتے ہیں؟؟

کیا اس معلومات کے باوجود بھی آگے کی زندگی بھی غفلت میں گزارنے کا دل چاہے گا؟؟

اگر پھر بھی آنکھیں نہ کھلیں تو یاد رکھیں! ہماری ہلاکت قریب ہے اور ہم اندھیرے کی کھائی میں گرے پڑے ہیں۔

میری بہنو! وقت قلیل ہے، سفر قریب ہے۔

ہمیں اپنا محاسبہ کرنا ہوگا، اس سے قبل کہ ہمارا محاسبہ ہو جائے اور ہمیں اپنے اعمال کی اصلاح کرنی ہوگی، ورنہ قریب ہے کہ یہ زادِ راہ کی قلّت کہیں ہمیں خسارے میں نہ ڈال دے اور تب سوچنے پر مجبور ہو جائیں، جب پچھتاوا مفید نہ ہو، کیونکہ جب ہاتھ سے سب کچھ نکل جاتا ہے، ہوش پھر ہی آتا ہے۔۔۔

لہٰذا عقل مندی سے کام لیں اور اپنی زندگی رب کی فرماں برداری سے خوش گوار بنا دیں اور ہاں! ماقبل کی زندگی پر دل چھوٹا بھی نہ کریں۔

ربُّ العالمین اگر قہار ہے تو رحمٰن بھی ہے، بلکہ بروئے حدیث رحمتِ عالی غضب پر غالب ہے۔

رَحْمَتِی سَبَقَتْ غَضَبِی (صحیح مسلم)

"میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی۔"

اس کی رحمت میں پناہ لے کر لا محدود اَن گنت، ریت کے ذرّات، پہاڑوں اور سمندر کی جھاگ کے برابر بھی گناہ صرف ایک دفعہ سچے دل سے توبہ کر کے بخشوائے جا سکتے ہیں، لیکن بابِ رحمت بند ہونے سے پہلے پہلے "توبہ نصوح" پر گامزن ہونا شرط ہے، بصورتِ دیگر کوئی فائدہ نہیں۔۔۔

یاد رہے! عبادالرّحمٰن وہ ہی نہیں کہ جن سے گناہ سرزد ہی نہ ہوا ہو یا وہ فرشتوں کی طرح پاک وصاف ہوں بایں طور کہ مادۂ گناہ کے باوجود آج تک گناہ نہ کیا ہو بلکہ عبادالرّحمٰن میں اللہ کے وہ بندے بھی شامل ہیں جو اوّلاً گناہ سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں اور اگر بشریت کے باعث سرزد ہو بھی جائے تو توبہ میں دیر نہیں کرتے، فوراً ربُّ العالمین کے سامنے جھک جاتے ہیں اور توبہ نصوح کے ذریعے خود کو پاک وصاف کرتے ہیں، پھر ربُّ العالمین کی شان وہ یوں شفاف ہو جاتے ہیں جیسے کوئی گناہ کیا ہی نہیں تھا۔

ارشاد نبوی ﷺ ہے: اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهُ

"گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے گویا کہ اس نے کوئی گناہ ہی نہیں کیا۔"

پھر دیر نہ کریں۔

اللہ کی بارگاہ میں توبہ کریں۔

وہ ربُّ العالمین انتظار میں ہے۔

دعا ہے کہ اللہ ربُّ العزّت جہنم کی تپش سے محفوظ رکھے اور بروزِ قیامت عرش کی ٹھنڈک نصیب فرمائے۔ آمین!

بقیہ

سُرخ قلعہ

چاہیے۔" کملا نے اپنے چھوٹے بھائی سے کہا۔ انھوں نے ساری رات ایک درخت پر سوتے جاگتے گزاری۔

وہ پیڑ سے نیچے اترے اور دائیں بائیں دیکھتے ہوئے گھر کی طرف روانہ ہوگئے۔

حویلی کے کھلے کواڑ ان کا منہ چڑا رہے تھے۔ انھوں نے وسوسوں کو دور بھگاتے، دھڑکتے دل کے ساتھ چوکھٹ عبور کی۔ خیراتی نے کسی چیز سے ٹھوکر کھائی۔

"بھائی دھیان۔۔۔" کملا نے لالٹین اونچی کرتے کہا، مگر الفاظ بیچ میں ہی رہ گئے۔

سامنے ہی نظام الدّین کی خون میں لت پت لاش پڑی تھی۔ دونوں گرنے کے انداز میں بیٹھے، ہلا جُلا کر دیکھا، مگر کوئی سانس باقی نہیں تھا۔

"یا اللہ! خیر! جلدی کرو! اندر چلو! باقی لوگوں کو دیکھو!" خیراتی جلدی سے اٹھتے ہوئے بولا۔

چند قدم آگے بڑھے تو بیٹوں کی لاشیں دیکھ کر قیامت گزر گئی۔ حویلی کے ہر کمرے میں عورتوں اور بچوں کے کٹے پھٹے جسم بکھرے پڑے تھے۔ ہر کسی کو ہلا جلا کر دیکھا کہ شاید زندگی باقی ہو، مگر دھڑکنیں رُک چکی تھیں۔ انھوں نے سب جگہ ڈھونڈا، مگر خوشی محمد کہیں موجود نہیں تھے۔ وہ ٹھٹکے، انھیں بھتیجے کے سکھ استاد کا خیال آیا۔ اپنے پیاروں پر الوداعی نظر ڈالی، جنھیں بے گور وکفن چھوڑ رہے تھے۔ ان در و دیوار کو آخری بار حسرت سے دیکھا، جہاں زندگی کے شب و روز گزرے تھے۔ کچھ ضروری سامان ساتھ لیا اور خود کو گھسیٹتے ہوئے نکل کھڑے ہوئے۔ سکھ استاد کے پاس پہنچے، بھتیجے کو وہاں صحیح سلامت پا کر خدا کا شکر ادا کیا۔

"حالات کی خرابی کی وجہ سے میں نے لڑکے کو یہیں روک لیا تھا، لیکن مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ آپ کے گھر پر قیامت ٹوٹ پڑے گی۔" ساری کتھا سن کر استاد نے دُکھی لہجے میں کہا۔

وہ بھتیجے کو ساتھ لے کر وطنِ عزیز کی طرف چل پڑے۔

تینوں نے کھانے پینے کے سامان کا ایک ایک تھیلا کندھوں پر اٹھایا ہوا تھا، جس میں تقریباً پانچ پانچ کلو وزن تھا۔ یہ چھوٹا سا قافلہ رات کو سفر کرتا اور دن کا وقت درختوں اور جھاڑیوں کی پناہ میں چھپ کر گزار دیتا۔ دشمن کی بستیوں کے پاس سے گزرتے ہوئے چوکنا رہتے، ذرا سی آہٹ پر بے حس و حرکت ہو جاتے۔ راستے میں کتنی ہی لاشوں سے ملاقات ہوئی۔ تین دن کا سفر کر چکے تھے کہ ایک قافلے سے ملاقات ہوئی۔ ان کے ساتھ خواتین، بچے اور کافی تعداد میں مرد تھے۔ یہ بھی ان کے ساتھ شامل ہوگئے۔ ایک جگہ کچھ کافروں نے حملہ کیا، مگر ان کی تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ کچھ ہی دیر میں بھاگ گئے۔ ہندوؤں نے جگہ جگہ ندی نالوں میں زہر ملا دیا تھا، جس کی وجہ کتنے ہی لوگ جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ان لوگوں کے پاس کچھ نہ کچھ کھانے پینے کا سامان تھا۔ کبھی فاقہ کر لیتے اور کبھی تھوڑا بہت کھا لیا جاتا۔ چلتے چلتے پیروں میں زخم ہو چکے تھے، ٹانگیں سوج گئی تھیں، لیکن جان بچانے کے لیے آگے بڑھتے رہنا تھا۔

تینوں چچا بھتیجے قافلے سے الگ ہو کر پانی کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ کھوجتے کھوجتے ایک گاؤں کے قریب جا پہنچے۔ یہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ گاؤں والوں نے انھیں کھانا پانی دیا۔ وہ چاہتے تھے کہ قافلے والوں کو بھی یہاں لے آئیں، تاکہ ایک رات سکون کی گزار کر، کچھ تازہ دم ہو کر، اگلے دن کا سفر شروع کیا جائے۔ جلدی جلدی وہاں پہنچے تو ہر طرف بکھری لاشوں اور بہتے خون نے ان کا استقبال کیا۔ وہ ایک بار پھر اکیلے تھے۔ کٹھن سفر باقی تھا۔ ایک دن وہ لوگ ایک گھنے پیڑ پر خود کو پتوں میں چھپائے بیٹھے تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ سکھوں کا ایک گروہ ہتھیار لہراتے، شور مچاتے، بھاگا چلا آ رہا ہے۔

"بھاگو!۔۔۔ پکڑو!۔۔۔ انھیں مار ڈالو۔۔۔!" کی آوازیں گونج رہی تھیں۔

چوں کہ دشمنوں کا رُخ انہی درختوں کی طرف تھا، جہاں وہ چھپے ہوئے تھے، لہٰذا ان کا ڈر نا فطری تھا، مگر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اُن میں سے کسی کی نظر ان پر نہ پڑی اور وہ پیڑوں تلے سے گزرتے چلے گئے۔ اسی طرح چھپتے چھپاتے پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا۔ شہیدوں کے چہرے آنکھوں کے سامنے گھوم گئے، جنھوں نے اپنا خون دے کر اس مٹی کو پہچان دی۔ سر سجدوں میں جھکتے چلے گئے۔ چہرے خوشی اور غم کی شدّت سے بھیگنے لگے۔

خوشی محمد کی اولادیں آج اس وطن میں آزاد اور خوش حال زندگی گزار رہی ہیں، جس کی بنیادوں میں ان کے اجداد کا خون ہے۔ اس خاندان کا ہر فرد ان کا قرض دار ہے۔ ہم اپنے پیارے دادا خوشی محمد صاحب کی قربانیوں کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ اللہ انھیں اور ان کے شہید خاندان کو کروٹ کروٹ جنّت نصیب کرے اور ان کی قبروں کو ٹھنڈا کرے۔ آمین!!

عالمی ادارہ

بیت السلام

ویلفیئر ٹرسٹ

BAITUSSALAM

2200+

یتیم بچے زیرِ کفالت

رہائش، خوراک، تعلیم و تربیت

Saiban

FOR ORPHANS

BAITUSSALAM

غلطی

بنتِ مسعود احمد

وہ چھوٹا سا بچہ اپنے ماموں کی انگلی تھامے جب نانی کے گھر کی دہلیز پر پہنچا، تب اس کی آنکھوں میں وہ خوشی معدوم تھی جو ہر دفعہ یہاں آنے پر اپنے کزن سے ملنے پر ہوا کرتی تھی۔اس کا ننھا سا دل بہت کچھ کھو دینے کے احساس سے بے چین تھا اور کئی فکریں وقت سے پہلے ہی اس کے ذہن کو بہت کچھ سوچنے سمجھنے پر مجبور کر رہیں تھیں۔کیا وہ ہمیشہ کے لیے یہاں آگیا ہے یا چند دن ٹھہرنے کے لیے۔۔۔وہ جاننے سے قاصر تھا۔اس کا بس نہیں چل رہا تھا، وہ پلٹ کر واپس اپنے گھر بھاگ جائے۔اپنے دادا دادی کے پاس اپنے ابو کے پاس۔۔۔اپنے کمرے میں اپنے کھلونوں کے بیچ۔۔۔مگر اب حالات اسے زبردستی ہی سہی یہاں کھینچ لائے تھے۔فرار اور واپسی کی ساری راہیں گم ہو چکی تھیں۔

وہ شادی ہو کر آئی تو ہر لڑکی کی طرح وہ بھی بہت خوش گمان تھی۔اسے لگتا تھا شریک سفر کے ہم راہ وہ ایک آئیڈیل اور پُر سکون زندگی گزار سکتی ہے۔

اس نے پہلے ہی طے کر رکھا تھا کہ کسی کو اپنی طرف سے شکایت کا موقع نہ دے گی۔وہ اپنی پوری کوشش کرے گی کہ سسرال کے طور طریقے دیکھے بھالے اور انھیں اپنا لے۔پہلے وہ خاموشی سے سب دیکھے گی، سیکھے گی اور پھر ان کے مطابق چلے گی، مگر اس کی ساس اس سے بہت سی توقعات لگائے بیٹھی تھیں۔وہ سمجھتی تھیں کہ آنے والی فوراً انہی کی طرح کا سب کام کر کے دکھادے گی۔اس کی ساس یہ عقد شروعات میں ہی کھول چکی تھیں کہ انھوں نے شادی میں جلدی اسی لیے کی ہے کہ انھیں گھر کے کاموں کو اکیلے نمٹاتے پریشانی تھی، گویا وہ بیٹے سے زیادہ گھر کے کاموں کے لیے لائی گئی تھی۔آتے ہی ذمہ داریوں کا بوجھ اور ہر دن تنقیدوں پابندیوں کے نشتر۔۔۔اس نے جیسا سوچ رکھا تھا ویسا بالکل نہیں ہوا تھا۔اس کی ساس کے پاس جلد ہی اس کی شکایتوں کے انبار جمع ہو چکے تھے۔شادی کے پہلے ماہ ہی بہو گھر کی عدالت میں کھڑی تھی۔وہ اپنی صفائی میں چند کم زور جملے کہہ کر رو دی، مگر انسانوں کے آگے رونا کم زوری ہے، جس کا خوب فائدہ اٹھایا گیا۔وہ سمجھی تھی شاید شوہر اس کا ساتھ دے گا، وہ تو سب سمجھ رہا تھا، مگر شوہر کا ایک جملہ اسے حواس باختہ کر گیا وہ کہہ رہے تھے کہ جانا چاہتی ہو تو چلی جاؤ۔۔۔

کیا ماں باپ کی دہلیز پر واپس پلٹنا اتنا ہی آسان ہوتا ہے۔بدگمانیوں کی آندھیوں میں گھر تیزی سے بکھر جاتے ہیں۔عروہ نے اپنی ماں کی زندگی سے تو ایک ہی سبق سیکھا تھا، صبر اور برداشت کا۔۔۔وہ کس منہ سے اپنے ہاتھوں اپنا گھر برباد کر کے نکل جاتی۔نہیں نہیں۔۔۔اس نے خود کو کم زور پڑتے دیکھا تو فوراً سہارا دیا۔

کیا وجہ ہے کہ اس کا شوہر بھی حق بات کہنے اور سننے اور سمجھنے پر راضی نہ تھا۔یہ کیسا محبت بھرا رشتہ ہے، جہاں احساس کا گزر تک نہیں۔

وہ اسکول سے آیا تو اس نے چاہا جلدی سے کپڑے بدل کر کھانا کھالے، مگر اس کا ہم عمر کزن اس سے پہلے تیزی سے واش روم میں جا گھسا، اسے شدید غصہ آیا۔

”مامی! میں جا رہا تھا، اس نے مجھے روکا اور خود جلدی سے گھس گیا“ حازم نے مامی سے شکایت کی۔

”ارے صبر کیا کرو ذرا۔۔۔ابھی وہ آجائے تو تم چلے جانا۔“ اس کی مامی نے بیٹے کی سائیڈ لی۔

وہ ایک طرف کو چپ سادھے بیٹھ گیا۔اسے اپنے گھر کی راج دھانی یاد آنے لگی۔اسے اپنے دادا دادی کا لاڈ یاد آنے لگا، لیکن وہ ماضی تھا، یہ اس کا حال تھا۔

ماں کچن میں مصروف تھی۔اسے نہیں خبر ہوئی کہ ننّھا سا دل کس خاموشی سے ٹوٹ کر بکھر گیا تھا، جس کی کرچیاں سمیٹنے میں اس کی پوری عمر لگ سکتی تھی۔

ماں بننے کی خبر سسرال کے ناموافق حالات میں اس کے لیے بڑی خوش کن تبدیلی لے آئی تھی۔وہ اب بھی عجیب و غریب رویے سہ رہی تھی۔فرق یہ تھا کہ وہ اب اپنے آپ میں مگن اور رب کی عطا پر مطمئن سی رہنے لگی تھی، نہ اس کے کاموں میں کمی کی گئی تھی نہ ہی رویوں میں کوئی لچک پیدا ہوئی تھی۔انہی سب حالات سے نمٹتے وہ ایک بیٹے کی ماں بن گئی اور اس کی ذمہ داریاں مزید بڑھ گئیں۔

اسکول کی فیس گو اس کی ماں جاب کر کے ہی بھر رہی تھی، مگر سختی اور نگرانی کا چارج ماموں نے سنبھال رکھا تھا۔

وہ دن بدن خاموش ہوتا جا رہا تھا۔اکثر ماموں کی سختی سے گھبرا کر وہ رو دیتا۔وہ پڑھائی میں کم زور کیوں جا رہا ہے؟ اس کا دل پڑھنے میں کیوں نہیں لگتا؟ وہ کیوں افسردہ رہنے لگا ہے؟ کسی کو اس کے اندر کی بات جاننے کا نہ شوق تھا نہ کھوج۔۔۔وہ اپنی کل کائنات کھو چکا، وہ اپنے باپ کی شفقت سے محروم ہو چکا۔ماں تو خود سے بیگانہ تھی جو کسی روبوٹ کی طرح جاب اور گھر کے کاموں کے بیچ گھن چکر بنی تھی۔

وہ جب جاب پر جاتی تو وہ مامی کے رحم و کرم پر ہوتا، جو اس سے وقتی ہم دردی اور بے زاری کا اظہار تو کر سکتیں تھیں، مگر ممتا کی کمی پوری نہیں کر سکتیں تھیں۔

کئی چھوٹی چھوٹی خواہشوں کو وہ دل ہی دل میں دبا لیتا۔ایسا اس کے ساتھ کیوں ہو رہا تھا؟ صرف اس لیے کہ اس کا باپ بری صحبتوں میں پڑ کر نشے کا عادی ہو چکا تھا یا پھر اس لیے کہ اس کی ماں کو کچھ نفسیاتی عارضے لاحق تھے اور وہ ایسی ذہنی استعداد نہیں رکھتی تھیں جو

بقیہ صفحہ نمبر 28 پر

خالی برتن

تنزیلہ احمد

گئے زمانے کی بات ہے۔ چین کے ایک بادشاہ نے اپنی سلطنت کے لیے ولی عہد کا انتخاب کرنے کی خاطر ایک مقابلے کا اعلان کیا۔ بادشاہ بوڑھا ہو رہا تھا اور اس کا کوئی بیٹا نہ تھا جو تخت سنبھال سکے۔ اس زمانے میں نوجوان ہی تخت اور سلطنت پر حکومت کیا کرتے تھے۔ بادشاہ کی اک خاص بات تھی کہ اسے پودے اور گل بوٹے اگانے سے محبت تھی، لہٰذا اس نے اعلان کیا کہ جو نوجوان ولی عہد بننے کا خواہش مند ہے، وہ محل میں تشریف لائے اور شاہی بیج لے جائے۔ چھ ماہ کے عرصہ میں جو بھی بیج سے سب سے خوب صورت پودا اگائے گا، وہ ہی مقابلہ جیت کر بادشاہ بننے کا اہل ٹھہرے گا۔ یہ خبر سن کر چین کے سبھی نوجوان خوشی سے پاگل ہو گئے۔ ہر کسی کو یقین تھا کہ وہ ہی سلطنت کا ولی عہد اور پھر بادشاہ بنے گا۔

سب فخر سے سر اٹھائے یوں محل پہنچنے لگے، جیسے وہ ہی مستقبل کے بادشاہ ہوں۔ ان کے والدین بھی خوب پُرجوش تھے۔ دل ہی دل میں وہ اپنے بیٹے کے ساتھ محل میں بسنے کے خواب سجا چکے تھے۔ ایک لڑکا جس کا نام جین تھا، وہ خوب مطمئن نظر آتا تھا۔

اسے معلوم تھا کہ پھول پودے اگانے میں وہ ماہر ہے۔ اس کے قصبے میں سب کی کوشش ہوتی کہ جین کے اگائے خربوزے، مٹر اور مکئی ہی حاصل کریں۔ ساری گرمیاں وہ فصل سے جڑی بوٹیاں تلف کرنے اور پودوں کو ادھر سے اُدھر منتقل کرنے میں گزارتا تھا، تاکہ ان کی بہترین بڑھوتری ممکن ہو سکے۔ مقابلے والے روز جب شاہی بیج بانٹے جانے تھے، محل میں نوجوانوں کا ایک بڑا مجمع لگا ہوا تھا، ان میں جین بھی شامل تھا۔ دوسروں کی طرح اس نے بھی ایک شاہی بیج حاصل کیا اور کسی مقدّس شے کی طرح مٹھی میں بھینچے خوشی خوشی واپس لوٹ آیا۔ گھر لوٹتے ہی اس نے پودا اگانے کے لیے اپنے پاس موجود سب سے خوب صورت برتن نکالا۔ برتن کے پیندے میں پہلے بڑے پتھر رکھے اور اس کے اوپر چھوٹے پتھر رکھے۔ پھر پورے برتن کو اچھی اور زرخیز کالی مٹی سے بھر کر انگلی سے مٹی میں ایک انچ کا سوراخ کیا، پھر احتیاط سے شاہی بیج کو مٹی میں دبایا۔ مٹی برابر کرنے کے بعد پیار سے مسکراتے ہوئے اس نے مٹی کو تھپکی دی۔ اگلے کچھ دنوں تک وہ متواتر بیج کو پانی دیتا رہا۔ پورے چین میں شاہی بیج حاصل کرنے والے سب لڑکے یہ ہی کچھ کر رہے تھے۔ ہر کوئی روزانہ پیار سے بیج والے برتن کو دیکھتا اور سوچتا کہ کب ننّھا سا پہلا ہرا پتا اپنی جھلک دِکھلائے گا۔ دن گزرتے گئے اور جین بیج کا خیال رکھتے ہوئے پودا اگنے کا انتظار کرتا رہا۔ چن قصبے کا وہ پہلا لڑکا تھا، جس نے اعلان کیا کہ اس کے بوئے گئے بیج میں سے ہرا پتا نکل رہا ہے۔ یہ خبر سنتے ہی سب نے اسے مبارک باد دینا شروع کر دیں۔ چن نے خوشی کے نقارے بجائے کہ وہ جانتا ہے کہ سلطنت کا ولی عہد وہ ہی بنے گا۔ اس کے بعد ہن نے یہ اعلان کیا کہ اس کے بوئے بیج میں سے پودا نکل رہا ہے۔ اس کے بعد وانگ نے بھی ایسا ہی اعلان کیا۔

جین حسرت سے اپنے بوئے بیج کے برتن کو تکتا رہتا اور سوچتا کہ ننّھا پودا کیوں نہیں نکل رہا۔ باقی لڑکے بھی کم و بیش ایسی ہی صورتِ حال سے دوچار تھے۔

کچھ عرصے بعد شاہی بیجوں سے ننّھی کونپلیں کھلنے کی خبریں سارے چین سے گونجنے لگیں۔ لڑکوں نے اپنے اپنے برتن باہر دھوپ میں رکھ دیے، تاکہ ننّھی کونپلیں کھل کر جلد پھول بن سکیں۔ کئی لڑکے تو پہرے دار بن کر اپنے پودے کے برتن کے پاس ہی بیٹھے رہتے تھے۔ جین کو یقین تھا کہ ماسوائے اس کے سب لڑکوں کے بوئے بیج میں سے پودے نکل چکے ہیں۔ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ ایک روز اس نے بیج کو برتن سے باہر نکالا اور نئے برتن میں دبانے کی ٹھانی، اس اُمید کے ساتھ کہ اس بار تو ننّھا ہرا پتا ضرور اپنی جھلک دِکھائے گا۔ اپنے باغیچے سے اس نے سب سے زیادہ زرخیز اور اچھی کالی مٹی سے برتن کو بھرا۔ مٹی کے ہر ڈھیلے کو اپنی مٹھی میں لے کر بھربھرا کیا، مٹی کے ننھے ننھے ذرے کیے اور پھر احتیاط سے شاہی بیج بو دیا۔ پیار سے مٹی کو تھپکی دینا وہ نہیں بھولا تھا۔ وہ روزانہ بیج کو پانی دیتا اور برتن کو دیکھتا رہا، مگر اس بار بھی بیج نہ پھوٹا۔ دوسرے لڑکوں کے بیجوں سے نکلی کونپلیں اب بڑے اور شان دار پودوں میں بدل چکی تھیں۔ جین سر جھکائے قصبے سے گزرتا اور دوسرے لڑکے اسے دیکھ کر ہنستے رہتے۔ کہیں بھی کوئی چیز خالی ہوتی تو اسے یہ کہہ کر چھیڑتے اتنا خالی جتنا جین کا خالی برتن۔

جتنا جین کا خالی برتن۔۔۔ تھک ہار کر جین نے ایک بار پھر بیج کا برتن بدلنے کا فیصلہ کیا۔ اس بار اس نے ایک سوکھی مچھلی لی۔ اسے پیس کر سفوف بنایا اور مٹی کی زرخیزی بڑھانے کی خاطر اسے مٹی میں شامل کر دیا۔ اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی پنگ کے شاہی بیج میں سے پودا نہیں نکل سکا تھا۔

چھ ماہ گزر گئے اور بالآخر وہ دن آ گیا، جس دن سبھی لڑکوں کو اپنے اپنے شاہی بیج سے اگائے پودے لیے محل پہنچنا تھا۔ چن، ہن اور وانگ سمیت سینکڑوں لڑکوں نے اپنے اپنے پودے والے برتن اس قدر چمکائے کہ وہ سورج کی طرح دمکنے لگے۔۔۔ پھر ایک ایک پتے کو انتہائی احتیاط سے صاف ستھرا کیا۔ اپنے پاس موجود بہترین لباس زیب تن کیے، وہ پودے لے کر محل جانے کے لیے بالکل تیار تھے۔ ان کے والدین نے اپنے اپنے بیٹے کے پودے کو نزاکت سے تھام رکھا تھا، تاکہ پودا مڑنے کی وجہ سے خراب نہ ہو۔

جین کھڑکی سے یہ منظر دیکھ کر اپنے والدین کے سامنے گڑگڑایا: ”میں کیا کروں؟ سبھی لڑکے فخر سے پودے تھامے محل جا رہے ہیں، جب کہ میرا برتن خالی ہے۔ میرے شاہی بیج سے پودا ہی نہیں اُگ سکا، میں کیا کروں؟“

”جس برتن میں تم نے شاہی بیج بویا، اسے لے کر ایسے ہی بادشاہ کے پاس جاؤ۔“ اس کے والد نے صلاح دی۔

”بالکل! تمہیں ایسا ہی کرنا چاہیے۔“ والدہ نے تائید کی۔

”تم نے اپنا بہترین دیا، پوری کوشش کی۔“

جین کا چہرہ مارے شرمندگی کے سُرخ پڑ گیا۔ جب وہ اپنا خالی برتن تھامے اس سڑک پر آیا جو محل کو جاتی تھی، اسی سڑک پر دوسرے لڑکے فخریہ انداز میں اپنے دراز قد پودوں کے برتن اٹھائے بخوشی چل رہے تھے۔ محل میں سب کو قطار میں کھڑا کر دیا گیا۔ انھوں نے اپنے اپنے شاہی بیج سے اُگنے والے پودے کے برتن تھام رکھے تھے۔ اسی بنا کر مقابلے کا فیصلہ کیا جانا تھا۔

بادشاہ اپنے سُرخ شاہی لباس میں ملبوس شان سے دھیرے دھیرے لڑکوں کے ہاتھ میں تھامے پودے دیکھتے ہوئے بے تاثر چہرے کے ساتھ خاموشی سے آگے بڑھتا رہا، جیسے ہی وہ جین کے قریب پہنچا اس کا خالی برتن دیکھ کر رُک گیا اور بولا:

”یہ کیا۔۔۔ تم میرے پاس خالی برتن لیے آئے ہو؟“

یہ سن کر جین کا ضبط جواب دے گیا، وہ زار و قطار رونے لگا اور روتے روتے بولا: ”بادشاہ سلامت! مجھے معاف کیجیے گا۔ میں نے اپنی کوشش کی، ہر طرح سے محنت کی، آپ کا دیا گیا شاہی بیج میں سب سے بہترین اور زرخیز مٹی میں بویا، ہر طرح سے اس کا خیال رکھا، باقاعدگی سے پانی دیتا رہا، مگر بیج نہ اُگ سکا۔۔۔ پھر میں نے بیج کو دوسرے برتن میں نئی مٹی ڈال کر بو دیا، مگر یہ نہ اُگا۔ میں نے ہمت نہ ہاری اور تیسری بار پھر اسے نئے سرے سے بویا، مگر یہ نہ اُگا۔ مجھے معاف کر دیں بادشاہ سلامت۔۔۔“ سر جھکاتے ہوئے جین نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔

”ہمم!“ یہ سن کر بادشاہ نے کہا اور پھر دوسرے لڑکوں کی طرف منہ کر کے گرج دار آواز میں بولا: ”میں نہیں جانتا کہ دوسرے لڑکوں نے وہ بیج کہاں سے لیے جن سے یہ پودے اُگا کر لائے ہیں۔ ہم نے مقابلے میں جو شاہی بیج سب کو دیے تھے، ان سے تو کوئی بھی پودا نہیں اُگ سکتا تھا کیوں کہ سبھی بیج بھنے ہوئے تھے، ان سے کچھ بھی اُگانا ممکن ہی نہ تھا۔“ یہ کہہ کر بادشاہ جین کو دیکھتے ہوئے خاص انداز میں مسکرا دیا تھا۔

ملاحظہ: مس ڈیمی کی تحریر کردہ یہ کہانی انگریزی ادب سے لی گئی ہے، جسے تنزیلہ احمد نے اردو قالب میں ڈھالا ہے۔

بقیہ

غلطی

نشے کے عادی شخص کو دوبارہ سے نارمل زندگی کی طرف راغب کر سکتیں۔

”ابو مجھے آپ ایک بڑا والا جہاز لا کر دے دیں گے۔“ علی نے باپ کے کندھے سے لٹک کر لاڈ سے فرمائش کی۔

”اور مجھے بڑی والی گڑیا چاہیے۔“ غنوی کہاں پیچھے رہتی فوراً باپ کے دوسرے کندھے پر سر ٹکا کر اترائی۔

”اچھا بابا! لے آؤں گا، بے فکر رہو۔“ کاپی پر میتھس کے سوال حل کرتا حازم بظاہر سر جھکا کر اپنے کام میں لگا تھا، مگر اس کا سارا دھیان ایک باپ اور دو بچوں کے درمیان ہوتے محبت بھرے مکالمے کی طرف تھا۔ اس کا معصوم ساذہن اسے دور پھر اسی ماضی میں لے گیا، جہاں وہ بھی اسی طرح اپنے باپ اور دادا سے لاڈ اٹھوایا کرتا تھا۔

اگلے دن ایک بڑا سا جہاز اس کے لیے بھی آ گیا تھا، مگر وہ باپ کا محبت بھرا لمس ایک تشنگی کی صورت اس کے ساتھ ہی پروان چڑھتا گیا۔

ایک بیٹے کے بعد اس کی گود میں ایک بیٹی، پھر ایک بیٹا آ گیا۔ اللہ نے دونوں نعمتوں سے اسے نوازا، مگر ساس کا رویہ بادستور روزِ اوّل کی طرح ہی کچھ بیگانہ سا تھا۔

اولاد سے اس کے شوہر کا رویہ بہت ہی نرم تھا۔ وہ بیوی سے زیادہ بچوں کو اہم جانتا۔ ان کی ہر اچھی بری خواہش پوری کرنا فرض سمجھتا۔

اکثر عروہ اور حازم کی لڑائی ہو جاتی۔

عروہ کا کہنا تھا کہ بچے تو بچے ہیں، وہ تو اپنی سمجھ کے مطابق فرمائش کریں گے۔ ہم ماں باپ ہیں، ہمیں سوچنا ہے کہ بچے کے لیے کیا اچھا اور کیا برا ہے۔ بچے کو کیا خبر۔۔۔ اسے تو ہر چمکتی چیز سونا لگے گی، چاہے وہ آگ کا شعلہ ہی کیوں نا ہو۔

مگر حازم یہ بات سمجھ نہ پاتا۔ وہ بچوں کو ہر اس احساسِ محرومی سے بچانا چاہتا تھا جو بچپن میں اس نے محسوس کی۔

عروہ کی ساس کے تلخ رویے کے پیچھے بھی ان کے ماضی کی تلخ یادوں کا سایا تھا۔ ان رویوں کو سمجھنا اور ان سے نمٹنا عروہ کے لیے بڑی آزمائش تھی۔ نہ وہ ان کے ماضی سے واقف تھی نہ ذہنوں کو پڑھ سکتی اور نہ وہ کسی ماہر نفسیات کی طرح ان کے رویّوں کا تجزیہ کر سکتی تھی۔

ایسی صورتِ حال میں ایک عرصے تک اسے خود بھی شدید ذہنی دباؤ کا سامنا کرنا پڑا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ کئی باتوں سے واقف ہوتی گئی۔ عروہ نے جانا اس کا شوہر اپنے رویے میں حق بجانب ہے، کیوں کہ خود اس نے باپ کی محبت کی کمی زندگی کے ہر موڑ پر محسوس کی اور یہ کمی وہ بچوں کو بھرپور لاڈ پیار دے کر پوری کرنا چاہتا ہے، پھر اس نے خود کو سنبھالا اور کوشش کی کہ وہ اپنی ذہنی حالت کو نارمل رکھے۔ وہ اب ساس اور شوہر کے رویّوں پر الجھنا اور پریشان ہونا چھوڑ کر ان سے سمجھوتا کر چکی تھی۔ یہ ساری کہانی ایک حقیقی زندگی کی ناکس ترجمانی کرتی ہے جو یہ ظاہر کرتی ہے کہ کسی ایک شخص کی غلطی کا خمیازہ کئی لوگوں کو آزمائش کی بھٹی میں جلا دیتا ہے، کچھ کو کندن بنا دیتا ہے تو کسی کو راکھ کر دیتا ہے۔

عالمی ادارہ بیت السلام ویلفیئر ٹرسٹ

سستی روٹی پراجیکٹ

لاکھوں روٹیاں مستحقین تک

5 روپیہ صرف عزت نفس کی خاطر

سپر فائن آٹا براہ راست بیت السلام ویئر ہاؤس بھی پہنچا سکتے ہیں کم سے کم 50 کلو

ہجرت

آمنہ عبدالباسط

"اماں! اماں! ہم نئے گھر کب جائیں گے؟" پندرہ سالہ سلیمہ نے اپنی گوٹا لگی اوڑھنی کو لوہے کے صندوق میں حفاظت سے رکھتے ہوئے پوچھا: "اری او چپ کر جا! دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ رب سائیں نے چاہا تو بہت جلد چلے جائیں گے، بس ذرا حالات کو ٹک جانے دے۔" مٹی کی چاٹی سے مکھن کا پیڑا نکالتی ہوئی اماں نے سلیمہ کو گھورا اور احتیاط سے پیڑا پیتل کے کٹورے میں ڈالتے ہوئے کچھ خیال آنے پہ ہول سی گئیں۔

"اور اب تُو باہر کھیلنے مت جانا، بلوائی ویسے ہی مسلمانوں کی بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ سنا ہے نیا دیس جلد بن جائے گا تو حالات اچھے ہو جائیں گے۔"

"اماں کیا میری سہیلی نیتو اور اس کے گھر والے بھی نئے دیس میں جائیں گے؟" سلیمہ نئے دیس میں تو جانا چاہتی تھی، لیکن نیتو سے بچھڑنے کا دُکھ کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

"اری! نیتو کیوں جائے گی؟ نیا دیس تو مسلمانوں کے لیے بنے گا، نیتو ہندو دھرم سے ہے، وہ تو یہیں رہے گی۔ چل تو اندر جا اور صندوق میں باقی کا ضروری سامان رکھ! اور دیکھ کسی کو مت بتائیو کہ ہم سامان کہاں کہاں رکھ رہے ہیں۔" اماں نے ایک بار پھر سلیمہ کو ہدایت کی اور خود اپنی گائے کو چھاؤں میں کرنے چل دیں، جہاں صبح کا سورج چڑھتے ہی دھوپ راج کرنے لگتی تھی۔

◆◆◆

"اماں ہمارے برتن سوکھ گئے ہیں، آج ان میں پہلی کھیر پکانی ہے، میں نیتو کے گھر چلی جاؤں؟"

"اماں نے کتنی بار منع کر دیا ہے کہ نیتو یا کسی کے بھی گھر نہیں جانا تو تُو بار بار ضد کیوں لگاتی ہے؟" نعیمہ کا بس نہیں چلتا تھا، چھوٹی بہن کو کہیں کوٹھڑی میں چھپا دے کیوں کہ جب سے نئے وطن کا شور اٹھا تھا تب لدھیانہ تو کیا پورے ہندوستان میں فساد شروع ہو گئے تھے اور سلیمہ پورے گاؤں میں سب سے سلیقہ مند اور چاند جیسی خوب صورتی کے ساتھ ایسی شفاف رنگت کہ ہاتھ لگائے میلی ہوتی۔ کئی بار تو اماں خود اس کو دیکھ کر پریشان ہو جاتیں کہ ایسے خوبصورت اور معصوم وجود کو کہاں چھپائیں، جبکہ سلیمہ سے بڑی تین بہنیں اور چار بھائی شکل وصورت اور قد کاٹھ میں ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ ستواں ناک، بڑی بڑی آنکھیں اور گوری رنگت اس خاندان کا خاصا تھے، جبکہ ابا اتنے بچوں کے باپ ہونے کے باوجود ایسے کڑیل جوان تھے کہ لڑکے بالے ان پہ رشک کرتے تھے۔ بڑی دو بیٹیوں سرداراں آپا اور شریفاں آپا کی شادی ہو چکی تھی۔ سرداراں آپا لاہور کے قریب موجودہ گوجرانوالا میں بیاہی گئی تھیں جبکہ شریفاں آپا وہیں دور دراز کے شہر میں بیاہ کر گئی تھیں، جبکہ سیدھی سادی صوم وصلوٰۃ کی پابند اماں خوب صورتی اور رکھ رکھاؤ میں اپنی مثال آپ تھیں۔

◆◆◆

ہزار منتوں کے بعد سلیمہ کو کھیل کی اجازت ملی تو وہ خوشی خوشی نیتو کے گھر کو دگئی۔

"نیتو نیتو کہاں ہو؟ چلو کھیر پکائیں!"

"نیتو تو نہیں ہے۔ آؤ میں پکوا دیتا ہوں کھیر!" گھر میں کودتے ہی اس نے نیتو کو آوازیں لگانا شروع کیں تو اس کا بھائی آنکھوں میں عجیب خباثت کے ساتھ مسکرانے لگا، تب سلیمہ کو ایک دَم احساس ہوا کہ اماں ان دونوں کو بار بار بلوائیوں کے حملوں کا کیوں بتاتی ہیں۔

وہ سب تو شروع سے اکٹھے کھیلتے تھے، مگر اس کی سہیلی کا یہ بھائی کبھی اس طرح نہیں مسکرایا تھا اور نہ ہی کبھی اسے غیر محفوظ محسوس ہوا تھا، جب سے ہنگامے شروع ہوئے تھے ہر ایک نے آنکھیں پھیر لی تھیں، جبکہ کل تک یہی بھائی نیتو کے ساتھ ان کی عزّت کا بھی رکھوالا تھا۔

"نہیں، میں کل آ جاؤں گی، اماں کو کام ہے۔" وہ الٹے قدموں واپس بھاگی اور اپنی کوٹھڑی میں جا کے دَم لیا۔

"کہاں تک بھاگو گی ننھی چڑیا!" راجیش حقارت سے کہتا ہوا اندرونی حصے کی طرف بڑھ گیا، جہاں اس کے دوست آئے بیٹھے تھے۔

◆◆◆

آج اماں نے میٹھے خشک لڈو بنائے تھے، تاکہ سفر پہ نکلیں گے تو ساتھ لے لیں گے، جانے کتنے دن کا سفر کرنا پڑے۔

"آہاہا! اماں آج کیا خوش بو آ رہی ہے، بھوک چمک گئی ہے میری تو" سردار بھائی عصر کی نماز پڑھ کر واپس لوٹے تو سارے گھر میں پھیلی لڈوؤں کی خوش بو سونگھ کر خوشی سے کہہ اُٹھے۔

"بیٹھ میرا لعل! یہ تم لوگوں کے لیے ہی بنائے ہیں۔" ان کا بانکا سجیلا بیٹا چہرے پہ نماز کا نور لیے پیڑی گھسیٹنے لگا تو وہ اپنے بیٹے کے واری صدقے ہونے لگیں۔

"ارے اماں! کچھ پھونکیں میرے اوپر بھی مار دو، میں بھی مسجد سے ہی آیا ہوں۔"

"جی کراں میرے ہیرے موتی! کتنی بار کہا ہے اکٹھے نہ آیا جایا کرو نظر لگ جاتی ہے۔ اللہ میری آنکھیں ٹھنڈی رکھے۔ آمین!"

سردار بھائی کے پیچھے ہی انوار بھائی نے داخل ہوتے ہوئے کہا تو اماں کے پیار و محبت میں ڈانٹ کی آمیزش بھی شامل ہو گئی اور دوبارہ سے سورت پڑھ کر اپنے جوانوں پہ پھونک مارنے لگیں اور اندر بہنوں کے ساتھ کھیل میں مگن فضل محمد باہر آیا تو اسے سرداراں آپا یاد آ گئیں۔

"سردار بھائی! نعیمہ آپا کہہ رہی تھی ہم نئے دیس میں سرداراں آپا کے پڑوس میں رہیں گے تو کیا میں روز وہاں آپا سے ملنے جا سکوں گا؟" دس سالہ فضل محمد کو سرداراں آپا بہت یاد آتیں جو ہو بہو اماں کی تصویر تھیں اور اسے اپنے بیٹوں کی طرح ہی پیار کرتیں جب سسرال سے آتیں، اس کے لیے کوئی نہ کوئی سوغات ضرور لاتی تھیں۔

"ہاں کاکے! ہم جلد اپنے نئے گھر میں چلے جائیں گے، جہاں آزادی کے ساتھ نماز روزہ کر سکیں گے، وہاں کوئی روک ٹوک نہیں ہو گی اور سُن! بیاہی بہنوں کے روز روز نہیں جاتے۔ ان کے خاوند یا سسرال کو برا لگ گیا تو ہماری بہن ہی دُکھی ہو گی۔"

"ابا جی! آج "بھا جی" کا پیغام آیا تھا کہ یہاں ریڈیو پہ بہت بُری خبریں آ رہی ہیں۔ سکھوں، بلوائیوں اور ہندوؤں نے ہر جگہ قیامت ڈھائی ہوئی ہے، کسی کو بھی علاقہ پار نہیں کرنے دے رہے۔

راستے میں ہی ذبح کر رہے ہیں۔ سب گھر والے تیار رہیں، میں سب کو راتوں رات بحفاظت اپنے گھر لے آؤں گا۔ یہ جگہ بالکل محفوظ ہے اور یہاں کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

سردار نے رواج کے مطابق چھوٹے بھائی کو سمجھایا اور ابا جی کو سرداراں آپا کے شوہر کا پیغام سنا دیا جو انھوں نے چھپ چھپا کے بھیجا تھا۔

"شمس الدّین کہہ تو ٹھیک رہا ہے، لیکن آج ہندو راجے نے پنچائیت بلائی ہے، دیکھو کیا فیصلہ کرتا ہے؟ گاؤں والے تو کہہ رہے ہیں کہ اچھا آدمی ہے، گاؤں بھر کا اچھا ہی سوچے گا۔"

"مگر ابا جی! اس راجے کا کیا بھروسا! ہم تیاری کر لیتے ہیں، بس گھر سے ہی نکلنا ہے، کچھ چیزیں تو محفوظ کر دی ہیں، باقی ساز و سامان اگر حالات ٹھیک ہوئے تو آ کر لے جائیں گے، ورنہ اللہ مالک ہے۔ کیا یہ کم نہیں کہ ہمیں اپنا الگ گھر مل رہا ہے تو اس سب کی کیا اہمیت؟؟"

"ہاں! کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو، بس فیصلہ آ جانے دو!"

سادہ لوح ابا جی جوان بیٹیوں کے ہم راہ نکلنے سے گھبرا نہیں رہے تھے، کیوں کہ ان کو یقین تھا کہ ہندو راجا دھوکا نہیں کرے گا۔

پنچائیت لگی اور فیصلہ سنا دیا گیا، جو جو نئے دیس پاکستان کے لیے ہجرت کرنا چاہے، وہ کل بڑے میدان میں آ جائے، سب کو ایک ساتھ بحفاظت ان کے وطن میں پہنچا دیا جائے گا اور جو یہاں رہنا چاہیں وہ بخوشی رہ سکتے ہیں!

ابا جی فیصلہ سن کے بہت خوش ہوئے، کیوں کہ ان کو ہجرت تو کرنا ہی تھی، بس اب یہ تسلی ہو گئی تھی کہ ان کو راستے میں تنگ نہیں کیا جائے گا، بلکہ راجا ان سب کی خود حفاظت کرے گا۔۔۔ مگر ابا جی سادہ لوحی میں بھول گئے تھے کہ یہ ہندو بنیا ہے، جس کے لیے "بغل میں چھری اور منہ میں رام رام" کی مثل مشہور ہے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ کل سجنے والا میدان ان کے اور خاندان کے لیے کتنی چھریوں اور چاقوؤں کے وار سے لیس ہو گا۔

حسبِ وعدہ اگلے دن تمام مسلمان ہجرت کے لیے خوشی خوشی گھروں سے نکل پڑے۔ نعیمہ اور سلیمہ ابا جی اور بھائیوں کے ہم راہ گھر سے نکلیں تو ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ اپنا گھر بار چھوڑ کر نکلنا کہاں آسان ہوتا ہے، جبکہ اماں نے تو اس گھر کے چپے چپے کو اپنے ہاتھوں سے سجایا تھا، مگر نئے دیس کی خوشی میں ایک نم الوداعی نظر اس گھر پہ ڈالی اور سب کچھ اللہ کی امان میں دے کر چل پڑیں۔

جیسے ہی سب میدان میں پہنچے تو بچوں، بوڑھوں اور جوانوں کی الگ الگ قطاریں بنا دی گئیں۔ حاملائیں الگ کر دی گئیں، کنواریاں الگ کھڑی کر دی گئیں۔ چشمِ زدن میں بلوائیوں کا جمگھٹا حملہ آور ہو گیا تو ہر قطار کے آگے ایک بنیا آ کھڑا ہوا۔ بوڑھوں کی قطار جس میں ابا جی بھی شامل تھے اور قریب ہی آگے راجا کی جگہ تھی، وہاں بس چند ہی لمحے لگے تھے اور حفاظت کے لیے اٹھی ہوئی تلواریں باری باری ہر قطار کی گردن اڑا رہی تھیں۔

حاملہ خواتین کے پیٹ میں خنجر گھونپ کر اندر پلنے والا بچہ نوک پہ اچھال کر کہا گیا: "لو دیکھو! یہ ہے نیا دیس، مسلوں کا پاکستان!"

اور ابا جی کے بے سُدھ کٹے ہوئے چہرے پہ راجا کی بے وفائی اور غم و غصے سے ساقط آنکھیں، ایک طرف کٹرِیل بریدہ شہید بیٹوں کی لاشوں اور دوسری طرف نعیمہ کو بالوں سے پکڑ کے زمین پہ گھسیٹتے دیکھنے سے قاصر تھیں۔ ان کی نازوں سے پالی ہوئی جوان اور خوب صورت بیٹیاں جنھیں کبھی ہاتھ سے بھی نہ چھوا تھا، آج زمین پہ گھسیٹی جا رہی تھیں۔ نعیمہ جو ماں باپ اور بھائیوں کو ذبح ہوتے دیکھ چکی تھی، اس گھسیٹنے، کھینچنے میں پتھر سے اس بُری طرح ٹکرائی کہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ سلیمہ جسے عزّت کے مفہوم سے ان چند دنوں میں آشنائی ہوئی تھی، وہ زور لگا کر سرپٹ بھاگی، راجیش کی نظر اسی پر تھی، سو بلوائیوں کی جماعت کے ساتھ تلوار لے کر اس کے پیچھے دوڑا۔ وہی راجیش جسے اماں نے اپنے ہاتھوں سے حلوے پکا پکا کر اپنے بیٹوں کے ہم راہ کھلائے تھے، آج وہ ان کے بیٹوں اور شوہر کے بعد اس کا حلوہ بنا دینا چاہتا تھا۔

ننگے پاؤں گرم ریت پہ سرپٹ دوڑتی ہوئی وہ دعا کر رہی تھی "مولا! آج بچا لے، آئندہ کبھی نیتو کے ساتھ نہیں کھیلوں گی۔" اس کی دعا قبول ہوئی اور وہ دوڑتے دوڑتے کنویں کی منڈیر کے قریب پہنچ گئی۔ اکھڑی ہوئی سانسوں کے ساتھ اپنی ساری ہمت جمع کی اور منڈیر پہ چڑھ کے عزّت کے گہرے کنویں میں چھلانگ لگا دی۔ جب تک راجیش اور بلوائی منڈیر پہ پہنچے، سلیمہ ڈوب چکی تھی۔

لوگ کٹتے، پٹتے، بچتے بچاتے کیمپوں میں پہنچ چکے تھے، جہاں آنے والوں کو وقتی پناہ دی جا رہی تھی۔ ان ہی میں سے ایک شریفاں آپا کا خاندان تھا، جس میں صرف ان کے شوہر اور وہ خود ہی بچ کر آ سکے تھے۔ شریفاں آپا نو مہینے کی حاملہ تھیں، ہزارہا صعوبتوں سے گزر کر وہ کیمپ میں پہنچیں اور ایک خوب صورت بیٹے کو جنم دیا۔ ابھی زچگی کے مراحل سے گزرے ایک ہفتہ ہی ہوا تھا کہ ان کے پورے گاؤں میں سے بچے کھچے صرف چند لوگ ہی بمشکل بچ کر کیمپ میں پہنچے تو ان سے آگ و خون کی جو داستان سنی تو بے قرار اباماں کو پکارنے لگیں۔

جب معلوم ہوا کہ ان کا پورا خاندان شہید ہو چکا ہے تو اتنے دنوں سے دیکھی ہوئی خون کی ہولی ان کے اندر سے الٹی کی صورت باہر آئی اور وہ ہفتے بھر کا بیٹا کیمپ میں روتا چھوڑ کے داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئیں۔۔۔!

ادھر اپنے میکے کے لیے دن رات آنکھیں دروازے پہ ٹکائے دل گرفتہ سرداراں آپا روز سب کا انتظار کرتیں۔ فضل محمد کی پسند کے میٹھے لڈّو احتیاط سے سنبھال رکھتیں کہ جانے کب ان کے بیٹے کا ہم عمر بھائی آئے اور اپنی پسند کا میٹھا کھائے۔ گھر تو کشادہ اور صاف ستھرا تھا ہی، لیکن وہ روز اماں ابا کی چارپائی کو بہت پیار سے تکتے ہوئے اپنی بہنوں اور بھائیوں کے لیے نئے سرے چمکانے لگتیں، نئی اوڑھنیاں جو بہنوں کے لیے کاڑھی تھیں سینت سینت کر رکھتیں۔ آنے والی ہر خبر کے ساتھ اپنے دل کو جوڑتیں اور اپنے ماں جائیوں کے انتظار میں پھر سے جُت جاتیں۔۔۔ لیکن ان کا انتظار زیادہ طول نہ پکڑ سکا، کوئی دو ماہ ہی گزرے ہوں گے شریفاں آپا کے شوہر بیٹے کے ساتھ دروازے پہ پہنچے تو سرداراں آپا کی آنکھیں خاندان کی روداد سُن کے پتھرا گئیں، پھر ان میں کبھی معمولی سی مسکراہٹ کا شائبہ تک نہ گزرا۔ صندوق میں رکھی اوڑھنیوں، میٹھے لڈو، اماں ابا کی چارپائیوں اور بھائیوں کے بیٹھنے کے لیے دھوئی ہوئی دریوں کو سرداراں آپا کی پتھرائی ہوئی آنکھیں بس سال بھر ہی حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ پائی تھیں۔ اس کے بعد آپا اور ان کی آنکھیں اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو روتا ہوا چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے سو گئی تھیں!

درخت لگاؤ، بخت جگاؤ

مہوش اسد شیخ

"شیر و بادشاہ! شیر و بادشاہ! باہر آیئے۔ ہم برباد ہوگئے اور آپ آرام فرما رہے ہیں۔"

"آپ کے ہوتے ہوئے ہم کم زوروں پر اتنا ظلم ہوگا، کبھی سوچا بھی نہ تھا۔"

"شیر و بادشاہ آپ کے انصاف اور امن پسندی کی دھوم دور دور تک مچی ہوئی ہے، ہمیں بھی انصاف چاہیے۔"

آرام فرماتے شیر و بادشاہ کی آنکھ مختلف پرندوں کی آوازوں کے شور سے کھل گئی۔ کچھ دیر تو وہ کسمسندی سے لیٹا رہا، وہ اس شور کی وجہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ ذرا جو حواس بحال ہوئے تو حالات کی سنگینی کا اندازہ ہوا، وہ تیزی سے باہر نکلا۔ شیر و بادشاہ کو باہر آتا دیکھ کر شور یک دَم تھم گیا۔

"کیا شور مچا رکھا ہے، صبح سویرے کون سی قیامت ٹوٹ پڑی ہے جو میری نیند حرام کرنے چلے آئے۔" شیر و کو اپنی نیند بہت پیاری تھی، وہ نیند خراب ہونے کا غصہ نکالنے لگا۔

"شیر و بادشاہ! آپ کی رعایا بے گھر ہو رہی ہے، آپ آرام سے کیسے بیٹھ سکتے ہیں۔" مینا نے ہمت مجتمع کرتے ہوئے بات شروع کی۔

"جو کہنا ہے کھل کر کہو، یہ پہیلیاں نہ بجھواؤ۔" شیر و کی پیشانی کے بل گہرے ہونے لگے۔

"رات ایک بہت بڑا طوفان آیا۔"

"طوفان! لیکن یہاں تو طوفان کے آثار نظر نہیں آرہے" شیر و نے حیرانی سے اِدھر اُدھر دیکھا۔

"یہ فلسفے جھاڑنے کا وقت نہیں ہے فاختہ بی!" بھوری چڑیا ہجوم کو چیرتے ہوئے آگے آئی۔ فاختہ کو اس کا ٹوکنا بہت ناگوار گزرا۔

"میں بتاتی ہوں شیر و بادشاہ!" شیر و بھوری چڑیا کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"ہم جنگل کے جنوبی حصے کے گھنے درختوں میں رہتے تھے۔"

"تھے" سے تمہاری کیا مراد ہے؟" شیر و نے اس کی بات کاٹی۔

"میری پوری بات تو سن لیجیے۔" چڑیا نے شیر و کو عجیب نظروں سے دیکھا تو وہ شرمندہ سا ہوگیا۔

"رات ہمارے علاقے میں بڑی بڑی گاڑیاں داخل ہوئیں۔ ان کے ڈرائیور اپنی گاڑیاں ایک طرف کھڑی کر کے گاڑیوں کے اندر ہی سو گئے۔ پہلے تو ہم متجسس ہوئے کہ یہ یہاں کیا کرنے آئے ہیں، لیکن جب ان کی طرف سے کوئی کاروائی نہ ہوئی تو ہم سمجھے وہ رات کے اندھیرے میں بھٹک گئے ہیں، ہم سب سکون سے اپنے اپنے گھونسلوں میں جا سوئے۔ آج صبح ہماری آنکھ خوفناک آوازوں پر کھلی۔ ہم کیا دیکھتے ہیں کہ جدید مشینری سے پیڑ کاٹے جا رہے ہیں۔ ہم سب پریشان ہوگئے، پہلے تو ہم سمجھے کہ وہ ضرورت کے دو چار درخت کاٹ کر چلتے بنیں گے، لیکن وہ جنگل کا صفایا کیے جا رہے ہیں۔ ہم سب کے آشیانے گر چکے ہیں، ہم بے گھر ہو چکے ہیں۔" مارے دکھ کے چڑیا مزید نہ بول سکی۔

"پہلا درخت کٹتے ہی تم لوگوں کو میرے پاس چلے آنا چاہیے تھا۔" شیر و گرجا۔

"ہم سے غلطی ہوگئی۔" بھوری چڑیا کم زور لہجے میں بولی۔

"چلو سب میرے ساتھ!" شیر و نے سب کو اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔

"رُک جایئے شیر و بادشاہ! ہم چھوٹے چھوٹے پرندے ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔" کوے نے پہلی بار زبان کھولی۔

"جی شیر و بادشاہ! کوا ٹھیک کہہ رہا ہے، وہ تعداد میں کافی ہیں اور ان کے پاس جانوروں اور پرندوں کے شکار کے لیے جدید اسلحہ بھی موجود ہے۔" نیلے طوطے نے کوّے کی تائید کی۔

"انھیں روکنا بھی تو ضروری ہے۔" شیر و تلملا کر رہ گیا۔

"میری رائے تو یہ ہے کہ جنگل کے سبھی بڑے جانوروں کو اکٹھا کر کے ان پر حملہ کیا جائے۔ اتنے جانور ایک ساتھ دیکھ کر وہ بوکھلا جائیں گے۔" کوّے نے تجویز پیش کی۔ سبھی کو کوّے کا مشورہ پسند آیا۔ باہمی مشاورت کے بعد پرندے جنگل میں پھیل گئے اور جانوروں کو اکٹھا کر لیا۔ ایک بڑا قافلہ جنوبی حصے کی طرف بڑھنے لگا۔

"رُک جاؤ!" ابھی وہ کچھ فاصلے پر ہی تھے، شیر و نے سب کو رُکنے کا حکم دیا۔

"یہ تو آپ سب جانتے ہیں کہ جنگ میں کچھ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی کی بھی جان جا سکتی ہے، میں نہیں چاہتا کہ میرے کسی بھی جانور کو کوئی تکلیف پہنچے۔"

"تو پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے۔" چیتے نے بے صبری سے پوچھا۔

"ہم سب ایک ساتھ شور مچائیں تو وہ یہ سوچتے ہوئے کہ جانوروں نے ان پر حملہ کر دیا ہے، اپنی جان بچا کر بھاگ کھڑے ہوں گے۔" شیر و کی بات سب کی سمجھ میں آگئی۔

سب سے پہلے شیر و نے پرندوں کو اشارہ کیا، انھوں نے چلانا شروع کر دیا۔ فضا پرندوں کی چیخ و پکار سے گونج اٹھی۔ درختوں کی لکڑیاں ٹرک میں بھرتے مزدوروں کے کان کھڑے ہوگئے۔ وہ کبھی آسمان کی طرف دیکھتے کبھی ایک دوسرے کی طرف۔ شیر و نے ہاتھیوں کو اشارہ کیا تو وہ زور زور سے چنگھاڑنے لگے۔ مزدوروں نے بھاگ کر اپنی اپنی بندوقیں اٹھالیں۔ اگلا اشارہ سب پرندوں اور جانوروں کے لیے تھا، اب سب ایک ساتھ شور مچا رہے تھے اور زمین پر پاؤں مارتے ہوئے یہ ظاہر کر رہے تھے کہ وہ بھاگتے ہوئے آرہے ہیں۔ اس شور نے انسانوں کو حواس باختہ کر دیا، وہ لکڑی بھول کر اپنی گاڑیوں میں سوار ہوئے اور تیزی سے جنگل سے نکل گئے۔ شیر و کے ساتھ باقی سب بھی اس ترکیب کے کام یاب ہونے پر نہال ہوگئے۔

"شیر و بادشاہ! زندہ باد!" سب جانور نعرے لگانے لگے۔

"اب ہمارے گھروں کا کیا ہوگا؟" نعروں کا شور تھما تو فاختہ افسردگی سے بولی۔

"ہم سب نئے گھونسلے بنانے میں آپ لوگوں کی مدد کریں گے" بھالو میاں نے ان کی ڈھارس بندھائی۔

"اس کے بعد ہمیں ایک کام اور بھی کرنا ہے، جتنے درختوں کا نقصان ہو چکا ہے، کم از کم اتنے بیج یا پودے نئے لگانے ہیں۔

"یہ پودے لگانے کا کیا فائدہ؟ ان کے درخت بننے تک ہم لوگ بھلا کہاں زندہ رہیں گے۔" لومڑی نے منھ بسورا۔

"اپنے ہاتھ سے لگائے پودے کے کیلے میں نہیں کھاپاؤں گا" بندر اُداس ہونے لگا۔

"یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم اپنی زندگی میں صرف وہی کام کریں جن کا ہمیں فوری فائدہ حاصل ہو رہا ہو۔ یہ سچ ہے کہ درخت لگاتا کوئی ہے، اس کا پھل کوئی اور کھاتا ہے۔" شیر و کی بات پر سب تفہیمی انداز میں

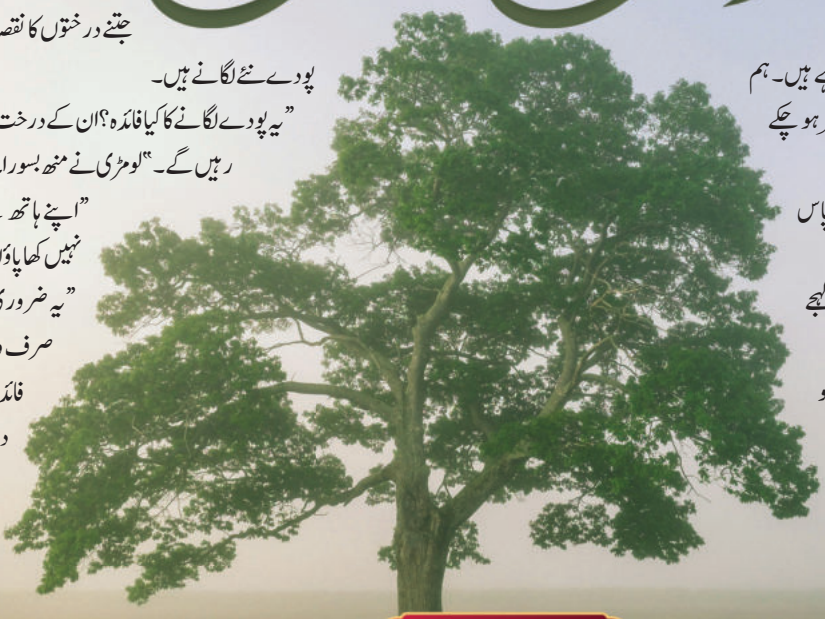

بھیّا اور 14 اگست

ڈاکٹر الماس روحی

بڑے بھیّا صرف میرے بھائی ہی نہیں، میرے سب سے اچھے دوست بھی تھے۔ اسکول میں اُن کے بغیر دل ہی نہیں لگتا تھا۔ وہ روز صبح میرے ساتھ اسکول جاتے، مجھے میری جماعت میں بٹھاتے اور پھر اپنی کلاس میں چلے جاتے۔ اگر کوئی مجھ سے بدتمیزی کرتا تو بھیّا فوراً میرا دفاع کرتے۔ وہ میرے محافظ تھے۔

14 اگست کے دن ہمارے لیے عید جیسا ہوتا تھا۔ ہم دونوں پہلی اگست سے ہی تیاری شروع کر دیتے۔ بازار سے جھنڈیاں خریدتے، آٹے کی لئی بناتے اور پھر مل کر گھر کے دروازے، کھڑکیاں اور دیواریں سجاتے۔ بڑا سا سبز ہلالی پرچم بھی دیوار پر لگاتے۔ ہم خوشی سے گلیوں میں دوڑتے، جھنڈا لہراتے اور ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرتے۔ اگر میں آگے نکل جاتا تو بھیّا ہنستے اور مجھے شاباش دیتے۔

بھیّا قائدِ اعظم سے بہت محبت کرتے تھے۔ اُن کے کمرے میں قائدِ اعظم کی تصویر اور پاکستان کا جھنڈا ہمیشہ لگا رہتا۔ وہ کہتے تھے: ”قائدِ اعظم ہمارے رہبر ہیں، ہمیں اُن کے راستے پر چلنا ہے۔“ ہر سال 14 اگست کو بھیّا اسکول میں تقریر کرتے۔ وہ جوش سے بولتے اور ہمیشہ انعام جیتتے۔ میں سب سے آگے بیٹھ کر تالیاں بجاتا اور خوش ہوتا۔

پھر ایک دن بھیّا نے میٹرک پاس کر لیا۔ ابا نے اُنھیں ہاسٹل بھیج دیا۔ میرا دل جیسے اُداس ہو گیا۔ اب اسکول تنہا لگتا تھا۔ بازار، باغ، درخت، سب سنّاٹے جیسے ہو گئے تھے۔ میں باغ میں جاتا تو بھیّا کی یاد آتی، جہاں ہم پھول چُنا کرتے، پیڑوں پر چڑھا کرتے۔ درختوں پر چڑھنا بھی تو مجھے بھیّا نے سکھایا تھا!

اس سال 14 اگست آیا، لیکن کچھ بھی ویسا نہ تھا۔ بھیّا نہیں تھے۔ دل اداس تھا، گھر سُونا تھا۔ اسکول کی تقریب بھی پھیکی لگی۔ میں جانتا تھا کہ بھیّا کو چھٹی نہیں ملی، وہ نہیں آئیں گے۔

میں شام کو چپ چاپ گھر آ گیا۔ امی نے بریانی بنائی تھی، ابا نے جھنڈے لائے تھے، لیکن میرے چہرے پر مسکراہٹ نہیں تھی۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے بے دلی سے دروازہ کھولا اور بھیّا کو سامنے کھڑے پایا!

”بھیّا!“ میں خوشی سے چیخا۔

”میں 14 اگست کو کیسے بھول سکتا ہوں؟“ بھیّا نے مسکرا کر کہا۔

میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ سب کچھ ایک دم روشن ہو گیا۔ وہی پرانی خوشبو، وہی جھنڈیاں، وہی ہنسی، وہی دوڑیں۔۔۔ جیسے وقت پلٹ آیا ہو۔ اس سال بھی ہم نے 14 اگست دھوم دھام سے منایا۔ کیوں کہ 14 اگست صرف جشنِ آزادی کا دن نہیں، یہ ہمارے اپنوں سے جُڑنے، محبت بانٹنے اور پاکستان سے وعدہ نبھانے کا دن بھی ہے۔

سر ہلانے لگے۔

”اگر بیج بونے والا یہ سوچے کہ جب بیج نمو پا کر پودا بنے گا اور سایہ دار درخت میں تبدیل ہو کر پھل دینے کے قابل ہو گا تب میں اس دنیا میں نہیں ہوں گا، وہ بیج نہیں بوئے گا۔ اگر ہم فوری یا ذاتی فائدے کا سوچیں گے تو زندگی میں کچھ بھی نہیں کر پائیں گے۔ ہماری خود غرضی آنے والی نسلوں کے لیے نقصان دہ ثابت ہو گی۔ آج ہم اس ہرے بھرے جنگل میں بس رہے ہیں، کیا یہ درخت ہم نے خود اگائے ہیں؟“ شیر و بادشاہ نے سب پر ایک کڑی نگاہ ڈالی۔

”کسی نے بہت پہلے یہ پودے لگائے تھے جو آج ہمیں خوراک اور مسکن فراہم کر رہے ہیں۔“

”کبھی کبھی ہمیں پھل فوری بھی مل جاتا ہے“ بھالو میاں نے مسکراتے ہوئے بادشاہ کی بات کاٹی۔

سب حیرانی سے ان کی طرف دیکھنے لگے کہ ایسا کون سا بیج ہے جو فوری پھل دینے لگتا ہے۔

”میں آپ کو ایک کہانی سناتا ہوں، پھر آپ میری بات کا مطلب سمجھ جائیں گے۔“ بھالو میاں سب کے درمیان آ کھڑے ہوئے اور کہانی سنانے لگے۔

”ایک دفعہ ایک بادشاہ کا گزر ایک بوڑھے شخص کے پاس سے ہوا، جو چھوٹے چھوٹے پودے لگا رہا تھا۔ بادشاہ نے کہا: ”اے بوڑھے! کیا تجھے ان درختوں کے پھل کھانے کی اُمید ہے؟“

بوڑھے نے کہا: ”بادشاہ سلامت! ہمارے پہلے لوگوں نے پودے لگائے تو ہم لوگوں نے فائدہ اٹھایا۔ اب میں اپنے بعد آنے والوں کے لیے یہ محنت کر رہا ہوں، تاکہ وہ نفع حاصل کر سکیں۔“

بادشاہ کو اس کی یہ بات بہت پسند آئی۔ اس نے خوش ہو کر اسے ایک ہزار اشرفیاں انعام کے طور پر دیں۔

اس پر بوڑھا کاشتکار کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ بادشاہ نے حیرت سے ہنسنے کی وجہ پوچھی۔

بوڑھا بولا: ”مجھے اس قدر جلدی پھل ملنے پر تعجب ہوا۔“ اس بات پر بادشاہ نے مزید خوش ہو کر اسے ایک ہزار اشرفیاں اور دے دیں۔ بوڑھا کاشتکار پھر ہنسا۔ بادشاہ نے دوبارہ ہنسنے کی وجہ دریافت کی تو وہ بولا: ”آپ آئے اور سوال کیا کہ مجھے پھل کھانے کی اُمید ہے؟ دیکھیے! مجھے تو اس تھوڑی سی دیر میں دو دفعہ پھل مل گیا۔“ کہانی مکمل ہوئی تو بھالو میاں کے ساتھ باقی سب بھی مسکرانے لگے۔

”نیک نیتی کا اجر ضرور ملتا ہے۔“ لومڑی نے کہا تو سب اس کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے، انھیں لومڑی سے ایسی اچھی بات کی توقع نہ تھی۔ لومڑی نے انھیں نظر انداز کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔

اسلام میں بھی درخت لگانے کی بہت اہمیت بیان کی گئی ہے۔ حضرت محمد ﷺ نے شجر کاری کو فروغ دینے کے لیے ایمان والوں پر شجر کاری کو صدقہ قرار دیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”مسلمان درخت لگائے یا فصل بوئے، پھر اس میں سے جو پرندہ، انسان یا چوپایا کھائے تو وہ اس کی طرف سے صدقہ شمار ہو گا۔“

”بہت پیاری بات کہی لومڑی بی نے۔“ شیر و اس کے لیے تالیاں بجانے لگا تو سبھی نے شیر و بادشاہ کا ساتھ دیا۔

باقی باتیں پھر کریں گے، چلیے ابھی ہمیں رات ہونے سے پہلے بہت سے پرندوں کے گھر بنانے

ننھا پاکستانی

مریم رضوان

”امی! آج سے اگست شروع ہو گیا! کب لگائیں گے جھنڈا؟ اور باجا۔۔۔ وہ بھی لینا ہے نا؟“ آصف نے ناشتا کرتے ہی اپنی چمکتی آنکھوں سے پورا گھر جگا دیا۔

امی نے پراٹھا پلٹتے ہوئے سر اُٹھایا: ”اتنی جلدی؟ ابھی تو مہینہ شروع ہوا ہے، بیٹا!“

آصف بولا: ”امی! اسکول میں اعلان ہوا ہے، جو بچہ سب سے پہلے جھنڈا لگائے گا، اُس کی تصویر اسکول کے بورڈ پر لگے گی!“ وہ بیگ کندھے پر ڈال کر باہر دوڑ گیا۔

راستے میں تیمور ملا، وہ بولا: ”آصف! باجے آ چکے ہیں بازار میں! میں ابّا سے قائدِ اعظم والی ٹوپی بھی منگوا رہا ہوں!“ دونوں دوستوں کے دل میں ایک ہی جذبہ: ”اس بار آزادی کا دن ایسا منائیں گے کہ پورا محلّہ دیکھے گا!“ آصف ایک 10 سالہ بچہ ہے، چوتھی جماعت میں پڑھتا ہے اور 14 اگست کا شدّت سے انتظار کر رہا ہے۔ سارا محلّہ سبز و سفید رنگ میں رنگنے لگا۔ جھنڈیوں کی لڑیاں، بیج جیسے ہر بچہ ”وطن کا سفیر“ بن چکا ہو۔ آصف بھی کبھی قائدِ اعظم کی ٹوپی، کبھی جھنڈیاں لاتا۔ آخر کار وہ باجا بھی آ گیا، جس نے پورے محلے کو سر پر اٹھا لیا تھا۔

دادا جان (سر دباتے ہوئے): ”باجے بجا بجا کر دماغ چٹ کر دیا ہے!“

آصف ہنسا: ”دادا ابو! بس 14 اگست تک ہی کی تو بات ہے!“

امی نے ٹوکا: ”بیٹا! کسی کو تکلیف دے کر خوشی منانا ٹھیک نہیں۔ نبی ﷺ نے فرمایا: کسی مسلمان کو تکلیف دینا حرام ہے۔“

آصف تھوڑا شرمندہ ہوا: ”سوری امی! ہم آرام سے بجائیں گے۔“ یہ کہہ کر باہر بھاگ گیا۔ دادا خاموشی سے ایک پرانا خط نکال کر مسکرائے۔

14 اگست آ گیا۔ پورا محلّہ سبز رنگ میں ڈوبا تھا۔ دیواریں جگمگا رہی تھیں، بچوں نے سبز کپڑے پہنے تھے۔ ہر ایک خوش تھا۔ سب کے نزدیک یہی حب الوطنی تھی، مگر۔۔۔ کسی نے نہ سوچا کہ سچ بولنا، صفائی رکھنا، بڑوں کا احترام بھی وطن سے محبت ہے۔

آصف اسکول پروگرام میں شریک ہوا۔ محلّہ گونج رہا تھا۔ بچے نعرے لگا رہے تھے: ”پاکستان زندہ باد!“

”یہ وطن ہمارا ہے!“ آصف فخر سے بھر گیا۔

اگلی صبح بارش ہوئی۔ آصف ناشتہ لینے نکلا تو سڑک پر کیچڑ میں جھنڈیاں گری ہوئی تھیں۔

دادا جان نے پکارا: ”یہی تھا تمہارا پاکستان زندہ باد؟ جس جھنڈے پر کل نعرے لگے، آج وہ پاؤں تلے؟

”صفائی نصف ایمان ہے!“ آصف نے اپنی لگائی ہوئی جھنڈی کو کیچڑ میں پایا، ایک بچہ اس پر پاؤں رکھے باجا بجا رہا تھا۔

”او بھائی! پاؤں ہٹاؤ نا، یہ جھنڈی ہے!“ آصف چیخا۔

بچہ ہنسا: ”یار! اب کیا جھنڈی کو بھی بچانا ہے؟ کل کی بات ہے!“ آصف نے جھنڈی اٹھائی، دامن سے صاف کی، آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

”کل فخر سے لگایا تھا۔۔۔ اور آج؟ مٹی میں روندے ہیں؟“ گھر آ کر آصف تمام جھنڈیاں اتارنے لگا۔

امی نے پوچھا: ”بیٹا! یہ کیا کر رہے ہو؟“

آصف نے کہا: ”امی، یہ صرف سجاوٹ نہیں۔۔۔ ذمہ داری ہے!“

اس نے دوستوں کو جمع کیا اور بولا: ”ہم نے نعرے لگائے، پٹاخے پھوڑے۔ مگر اصل پاکستانی ہونے کا ثبوت نہیں دیا!“

بچے ہنسے، تیمور بولا: ”کیا کہہ رہے ہو یار؟“

آصف نے سڑک کی طرف اشارہ کیا: ”جن جھنڈیوں کو چاہ سے لگایا، آج وہ پاؤں تلے آ رہی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”وطن سے محبت ایمان کا حصہ ہے!“

سب خاموش ہو گئے، ایک بولا: ”یار آصف۔۔۔ بات تو صحیح ہے!“

آصف نے ”ننّھے پاکستانی فورس“ بنائی اور اعلان کیا: ”ہم سب ممبر ہیں! نہ کسی لیڈر کی ضرورت ہے، نہ جلسے کی! ہم خود ذمہ دار بنیں گے!“ آصف سب کو سبز و سفید ربن دیتا ہے۔

ایک بچہ پوچھتا ہے: ”یہ ربن کیا ہے؟“

آصف: ”یہ پہچان ہے کہ ہم وہ پاکستانی ہیں، جو جھنڈا زمین پر نہیں گرنے دیتے اور سچ، صفائی، ادب کو نعرہ بناتے ہیں!“

تیمور بولا: ”اگر کوئی جھنڈی گر جائے تو؟“

آصف: ”ہاں، اٹھائیں گے! ہم سے جُڑی ہوئی ہے، گرنے ہی کیوں دیں؟“

بچے دیوار پر ایک پوسٹر لگاتے ہیں: قوانینِ ننّھے پاکستانی فورس:

- کوڑا نہ پھینکیں
- بڑوں کا ادب کریں
- جھنڈا نہ گرنے دیں
- جھوٹ اور شور سے دور رہیں
- روز ایک اچھا کام وطن کے نام

صفائی مہم چلی، جھنڈیاں سمیٹیں، بزرگوں سے معذرت کی اور بورڈ لگایا:

”یہ جھنڈے صرف لگانے کے لیے نہیں۔۔۔ سنبھالنے کے لیے ہیں!“

”وطن کی عزت صرف نعرے سے نہیں۔۔۔ کردار سے ہوتی ہے!“ 16 اگست کی صبح، محلّہ صاف تھا۔ لوگ حیران، خوش اور شرمندہ تھے۔

دادا جان نے آصف کو بلایا۔ ایک پرانا، جھریوں بھرا کاغذ نکالا: ”یہ تمہارے پردادا کا خط ہے، جو 14 اگست 1947 کو لکھا گیا تھا۔“

آصف: ”واقعی؟ اس میں کیا ہے دادا ابو؟“

دادا: ”آزادی ہمیں جھنڈوں سے نہیں۔۔۔ قربانی، سچ، صفائی، اخلاص، صبر سے ملی۔ ملک نعمت ہے، اسے کردار سے سنوارو! یہی آزادی ہے۔“

آصف نے کہا: ”دادا ابو! اب ہم ایسا پاکستان بنائیں گے۔۔۔ جو اس خط کے قابل ہو!“ دادا نے آصف کو سینے سے لگا لیا۔

آصف: ”جی دادا ابو! اب صرف جھنڈا نہیں لگاؤں گا۔ اُس کے نیچے اپنی زندگی بھی سنواروں گا!“ اور اس کی آواز گونجی: ”ہم وہ ننّھے پاکستانی ہیں جو جھنڈے صرف لہراتے نہیں۔۔۔ اُن کی حرمت کے لیے جھکتے بھی ہیں!“

”ننّھے پاکستانی فورس“ صفائی مکمل کرتی ہے۔ آصف بچوں سے کہتا ہے: ”آؤ حلف دہراؤ!“

ہم جھنڈا صرف لگاتے نہیں، اُس کی عزت بھی نبھاتے ہیں!
ہم نعرہ نہیں، عمل بنیں گے، سچے پاکستانی کہلائیں گے!
چھوڑیں گے جھوٹ، گندگی، فساد، بانٹیں گے ہم محبت، اتحاد!
صفائی، ادب، سچائی سے چمکے گا وطن، روشنی سے!

تالیاں بجتی ہیں، گانا گایا جاتا ہے۔ کھڑکیوں سے جھانکتے چہرے۔ خوشی سے چمکتے ہیں۔

اور اُس دن کے بعد، محلے میں کوئی جھنڈی زمین پر نہ گری۔

نہ کوئی بچہ شور مچانے نکلا، کیوں کہ وہ سب، اب صرف ننّھے نہیں۔ اصل پاکستانی بن چکے تھے۔!!

خواب سے حقیقت تک

ام محمد مصطفیٰ

رات کی تاریکی میں گاؤں کی تنگ گلیوں میں چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ علی اپنے گھر کی چھت پر لیٹا آسمان کو تک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک خواب تھا۔۔۔ فوجی بننے کا خواب! اس کے اِرد گرد کھلونا سپاہیوں کی قطاریں بچھی تھیں۔ علی نے ایک کھلونا اُٹھایا اور سرگوشی کی، "ایک دن میں بھی اپنے وطن کی حفاظت کروں گا۔"

علی کے والد ریاض صاحب ایک غریب کسان تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ علی پڑھ لکھ کر کوئی بڑا افسر بنے، مگر علی کا دل فوجی بننے میں لگا تھا۔ ایک دن اسکول میں مس عذرا نے تمام بچوں سے پوچھا: "بڑے ہو کر تم کیا بنو گے؟"

علی نے بلند آواز میں جواب دیا: "میں فوجی بنوں گا!" تمام بچے اس کی بات سن کر ہنس پڑے، مگر مس عذرا نے علی کی آنکھوں میں عزم دیکھ لیا تھا۔ اب سے مس عذرا علی کو پیار سے "سپاہی علی" کہہ کر مخاطب کرتیں، جسے سن کر علی کا سیروں خون بڑھ جاتا، لیکن امجد نام کا ایک لڑکا جو چاچا فضل کا بیٹا تھا وہ ہر وقت علی کو چڑاتا رہتا کہ "کیوں بھئی! کب سپاہی بن کر مرو گے؟" اور پھر اپنی ہی بات پر دانت کسوڑ کر ہنس پڑتا۔ پہلے پہل تو علی امجد کی باتیں سن کر بہت دل برداشتہ ہوتا، لیکن پھر مس عذرا کے سمجھانے پر وہ اس کی باتوں کو نظر انداز کرنے لگا۔ جب امجد نے دیکھا کہ علی اس کی باتوں سے چڑتا نہیں ہے تو اس نے بھی آہستہ آہستہ اس بات کو چھوڑ دیا، لیکن دل ہی دل میں وہ علی سے حسد ضرور کرتا تھا کیوں کہ علی نہ صرف ذہین تھا بلکہ اپنے خواب کی تعبیر پانے کے لیے خوب محنت بھی کر رہا تھا۔

وقت گزرتا گیا، علی نے محنت سے پڑھائی کی اور بالآخر میٹرک میں اس نے ہر مضمون میں اعلیٰ نمبر حاصل کر کے پورے ضلع میں نمایاں پوزیشن حاصل کر لی۔ اس دوران، اس کا دوست احمد ہر وقت اس کے ساتھ ہوتا۔ احمد بھی علی کے خواب سے متاثر ہو چکا تھا اور اس کی ہر بات میں حوصلہ افزائی کرتا رہتا۔

آرمی اکیڈمی میں داخلے ہو رہے تھے۔ علی نے اخبار میں جب یہ خبر پڑھی تو اس نے فوراً سے پیشتر وہاں پر اپلائی کیا اور امتحان دے دیا، جس کا چند دنوں بعد ہی نتیجہ آ گیا۔ علی نے آرمی اکیڈمی کے امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کی تھی۔

علی کے والد نے پورے گاؤں میں مٹھائی تقسیم کی اور پھر چند دنوں بعد ٹریننگ کے لیے علی کو آرمی اکیڈمی سے خط موصول ہوا۔ علی جوش و خروش سے جانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ علی کی والدہ اور بہن خوشی اور غمی کی کیفیت سے دوچار تھیں۔ علی کی اتنی بڑی کامیابی کی خوشی، لیکن جدائی کا غم ماں اور بہن کو رُلائے دے رہا تھا۔ علی کے والد بھی دل ہی دل میں بیٹے کی جدائی کے غم سے پریشان تھے، لیکن بیٹے کے عزم، ہمت، حوصلے اور حب الوطنی کو دیکھ کر ان کا سر فخر سے بلند ہونے لگتا اور پھر یہ جدائی کوئی معنی نہ رکھتی۔

آج علی کو گاؤں سے رخصت ہونا تھا۔

گاؤں کے تمام بڑے، بوڑھے علی کو بس اسٹاپ تک رخصت کرنے آئے، ہر ایک نے علی کو گلے لگایا اور ماتھے پر بوسہ دے کر خوب دعائیں دیں۔ علی نے بزرگوں کے ہاتھ چومے، دوستوں سے معانقہ کیا اور ہاتھ ہلاتا ہوا بس میں سوار ہو گیا۔

پوزیشن ہولڈر ہونے کی وجہ سے آرمی اکیڈمی میں ویسے ہی علی کو نمایاں نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، پھر اس نے اپنی اعلیٰ کارکردگی سے بھی اپنا لوہا منوا لیا۔

تمام بڑے آفیسر اس نوجوان کے تابناک مستقبل کو دیکھ رہے تھے، وہ جانتے تھے کہ ایسے با حوصلہ اور ولولہ انگیز نوجوان بہت کچھ کر گزرتے ہیں، یہ جذبہ ان کی طاقت ہوتی ہے۔

ایک دن کیپٹن فہیم نے علی کی کارکردگی دیکھ کر کہا، "علی! تم میں ایک بہادر سپاہی بننے کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔" علی کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔

اگلے چند مہینوں میں علی نے سخت ٹریننگ کی۔ وہ ہر صبح دوڑ لگاتا، ورزش کرتا اور کتابوں کا مطالعہ کرتا۔ اس دوران، اس کی بہن فاطمہ اور اس کا دوست احمد اسے باقاعدگی سے خط لکھتے۔ خط میں خیر خیریت کے ساتھ ساتھ اس کا حوصلہ بھی بڑھاتے، جس کی وجہ سے علی اپنے اندر ایک نئی توانائی محسوس کرتا۔

فاطمہ لکھتی: "بھائی! ایک دن تمہاری وردی پر تمغے ضرور سجیں گے۔"

آخر کار وہ دن آ گیا جب علی کو اپنی پہلی پوسٹنگ ملی۔ وہ خوشی سے اپنے والد کے پاس گیا اور ان کا ہاتھ چوم کر کہا: "ابا جان! میں فوجی بن گیا ہوں"

ریاض صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "بیٹا! مجھے تم پر فخر ہے۔"

پھر علی نے انھیں اپنی پوسٹنگ کے بارے میں بتا کر جانے کی اجازت چاہی۔

ریاض صاحب نے اسے گلے سے لگا کر خوش دلی سے اجازت دی۔

فوجی تربیت کے دوران علی نے ساجد سے دوستی کی۔ ساجد ایک تجربہ کار سپاہی تھا، جس نے علی کو جنگی حکمتِ عملی سکھائیں۔

"علی! دشمن کے ارادے ہمیشہ پہچاننے کی کوشش کرو، یہ ایک اہم جنگی اصول ہے۔" ساجد نے علی کو نصیحت کی۔

ایک دن، کیپٹن فہیم نے علی کو ایک خاص مشن پر بلایا۔

"علی! ہماری ایک اہم چوکی پر دشمن نے حملہ کر دیا ہے۔ کرنل بابر تمہیں اس مشن کی قیادت کرنے کے لیے منتخب کر رہے ہیں۔ کیا تم تیار ہو؟"

علی نے پُر عزم لہجے میں جواب دیا: "یس سر!"

وطن کی گلیاں اور بچپن کا جشنِ آزادی

حفصہ سلطان

گھڑی پر تاریخ بدلی اور تقویم نے بتایا: آج 14 اگست ہے!

دل کے کسی کونے میں ہلکی سی لہر اٹھی۔ میں نے فون پر قومی ترانہ لگایا، جھنڈیوں کی کچھ تصاویر دیکھی، اور پھر زندگی کی مصروفیات میں مشغول ہو گئی لیکن دل نہیں مانا۔ کچھ تھا جو اندر ہلکا سا ٹوٹا۔ اور پھر مجھے اپنا بچپن یاد آ گیا۔ وہ دن، وہ گلیاں، وہ جھنڈیاں، اور وہ خالص جذبے جو اب صرف یادوں میں بستے ہیں۔ مجھے آج بھی یاد ہے، جیسے کل کی بات ہو ہماری گلی چھوٹی سی تھی، لیکن جذبے بڑے بڑے تھے۔ ۱۴ اگست کی صبح پورا محلّہ کسی چھوٹے پاکستان کا منظر پیش کرتا تھا۔ ہر چھت پر سبز ہلالی پرچم لہراتا، اور ہر بچے کے ہاتھ میں ایک جھنڈی ضرور ہوتی۔

ہم محلے کے بچوں نے کئی دن پہلے سے ہی منصوبہ بنا لیا ہوتا تھا کون جھنڈیاں لائے گا؟ کون دیوار پر نعرے لکھے گا؟ اور پاکستان زندہ باد کا سب سے بلند نعرہ کون لگائے گا؟

یہ سب نہ ہم کسی مقابلے کے لیے کرتے تھے، نہ کسی تصویر یا ریل کے لیے یہ سب دل کی محبت سے کرتے تھے۔ ہم ریڑھیوں سے دوڑ دوڑ کر جھنڈیاں خریدتے، جنہیں رسّیوں میں پرو کر گلی میں لٹکاتے۔ امی سلائی مشین سے ہماری خوبصورت سی زبردست قمیص بناتیں ابو کبھی کبھار ایک چھوٹا سا جھنڈا خرید کر دروازے کے ساتھ لگا دیتے وہ جھنڈا میرے لیے فخر بن جاتا۔ 14 اگست کو علی الصباح پانی بھرتے، نہاتے، اور نئی قمیص پہن کر بیج سینے پر لگاتے۔ ہماری تیاری صرف ظاہری نہیں ہوتی تھی۔ ہم دل سے "پاکستان" کو محسوس کرتے تھے۔

پورے دن میں ریڈیو یا ٹی وی پر جو ترانے بجتے، وہ ہمارے دلوں میں گھر کر لیتے: یہ وطن تمہارا ہے، تم ہو پاسبان اس کے دل دل پاکستان، جان جان پاکستان ہم بچوں کو نغموں کے بول یاد ہو جاتے، اور ہم انہیں گلی میں دوڑتے ہوئے گنگناتے رہتے۔ ہمیں کسی ترانے کی میوزک یا سنگر کی فکر نہیں تھی، ہمیں صرف وطن کا نام سن کر سرور آتا تھا۔

چھوٹے سے ہاتھوں میں جھنڈی تھی، آنکھوں میں خواب تھے بچپن کا جشنِ آزادی، سب جذبوں سے نایاب تھے آج سوچتی ہوں، اس وقت ہمیں آزادی کے مفہوم کی گہرائی سمجھ نہیں آتی تھی، لیکن ہم "آزاد فضا" میں سانس لیتے ہوئے فطری طور پر خوش ہوتے تھے۔

ہم جانتے تھے ہم جہاں مرضی جا سکتے ہیں، ہم اپنے ملک کے مالک ہیں، اور ہمیں کسی سے ڈر نہیں۔ یہی احساس کافی تھا۔ یہی اصل جشنِ آزادی تھا۔

آج سوشل میڈیا پر چمکدار پوسٹیں، فینسی لباس، اور مہنگی فوٹو گرافی ضرور ہے، لیکن شاید جذبہ کہیں گم ہو گیا ہے۔ اب نہ وہ گلیاں ویسی ہیں، نہ وہ بچے، نہ وہ ترانے دل تک اترتے ہیں، نہ وہ جھنڈیاں ہاتھ میں تھام کر "پاکستان زندہ باد" کے نعرے لگتے ہیں۔

اب گلیاں ہیں ویسی، نہ ویسا ہے وہ شور نہ وہ بچپن رہا، نہ رہا وہ دستور شاید ہم آزادی کو فخر کی جگہ فیشن سمجھنے لگے ہیں۔ شاید ہم وطن کی محبت کو تقریر یا کیپشن تک محدود کر بیٹھے ہیں۔

میں اکثر چاہتی ہوں کہ وقت پلٹ جائے ایک دن کے لیے وہی چھوٹی سی گلی ہو، وہی بچے ہوں، وہی محلّہ ہو میں جھنڈی لے کر دوڑتی پھروں امی میرے ماتھے پر سبز ٹیپ چپکائیں، اور ابو دروازے پر جھنڈا لگاتے ہوئے کہیں: پاکستان سلامت رہے۔

اے میرے وطن! وہ بچپن کا جذبہ لوٹا دے مجھے پھر وہ معصوم محبت کا راستہ دکھا دے اب ہم بڑے ہو چکے ہیں، لیکن بچپن کی وہ محبت آج بھی دل میں زندہ ہے۔

مجھے احساس ہے کہ اب صرف جھنڈی لگانے سے کام نہیں چلے گا، اب ہمیں وطن کے لیے کچھ بن کر دکھانا ہے۔

وطن کو صرف ترانوں سے نہیں، بلکہ دیانت، محنت، اور کردار سے زندہ رکھنا ہے۔

میں اپنے بچپن کی ان گلیوں کا قرض اپنے عمل سے چکانا چاہتی ہوں۔

جو جذبے کبھی جھنڈے میں چھپے تھے اب وہ کردار میں ظاہر ہوں چلو پھر سے بچپن کی قسم کھا کر ہم وطن کے خادم ظاہر ہوں۔

علی نے ساجد اور اپنی ٹیم کے ساتھ اس چوکی کی جانب سفر شروع کیا۔ رات کی تاریکی میں وہ دشمن کی نقل و حرکت کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔ علی نے اپنے ساتھیوں سے کہا: "ہمیں ہر طرف سے چوکس رہنا ہوگا۔ دشمن کہیں سے بھی چھپ کر وار سکتا ہے۔"

فاطمہ ہر لمحہ اپنے بھائی کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہی تھی۔ ریاض صاحب مسجد میں بیٹھے اللہ کے حضور سجدہ ریز تھے۔ احمد گاؤں کے لوگوں کو حوصلہ دے رہا تھا، "ہمارا علی ضرور کامیاب ہوگا۔"

علی اور اس کی ٹیم نے دشمن کے ٹھکانے کا پتا لگا لیا۔ انھوں نے خفیہ طور پر آگے بڑھنے کی منصوبہ بندی کی، مگر اچانک ایک زوردار دھماکا ہوا۔ دشمن نے انھیں گھیر لیا تھا۔ علی نے اپنے ساتھیوں سے کہا: "پیچھے ہٹنے کا کوئی راستہ نہیں! آج ہمیں اپنے وطن کے لیے جان کی بازی لگانی ہوگی۔"

علی اور ساجد نے مل کر دشمن پر حملہ کیا۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ فضا میں گونج رہی تھی۔ علی نے ایک دشمن کے ٹھکانے کو تباہ کیا اور ساجد نے دوسرے گروہ کو پیچھے دھکیل دیا۔ کیپٹن فہیم وائرلیس پر علی سے رابطے میں تھے۔

"علی! ہمیں چوکی کی صورتِ حال بتاؤ؟"

علی نے جواب دیا: "سر! دشمن پسپا ہو رہا ہے۔"

آخر کار، علی اور اس کی ٹیم نے دشمن کو پسپا کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ علی کے کندھے پر ایک معمولی زخم تھا، مگر اس کے چہرے پر فتح کی مسکراہٹ تھی۔ اس نے ساجد کی طرف دیکھا اور کہا: "ہم نے کر دکھایا، دوست!"

گاؤں واپس پہنچنے پر گاؤں والوں نے علی اور اس کی ٹیم کا شاندار استقبال کیا۔ فاطمہ نے اپنے بھائی کو گلے لگا کر کہا: "بھائی! آج تم سچ میں ہمارے ہیرو ہو!"

ریاض صاحب نے علی کو سینے سے لگایا اور کہا: "بیٹا! تم نے ہمارا سر فخر سے بلند کر دیا۔"

احمد نے علی کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا: "تم نے ثابت کر دیا کہ خواب دیکھنے والے ہی اصل میں کامیاب ہوتے ہیں۔" اور اس طرح علی کا ایک خواب حقیقت میں بدل چکا تھا۔ وہ صرف ایک ذہین بچہ نہیں، بلکہ ایک بہادر فوجی بھی بن گیا تھا۔۔۔ اپنے وطن کا سچا محافظ!

تم کیا بنو گے؟

دانیل حسن چغتائی

رات کے دس بج رہے تھے اور زینب کے کمرے کی بتی جل رہی تھی جو اس بات کا اشارہ تھی کہ وہ ابھی جاگ رہی ہے۔ کمرے کے دروازے پر پہنچ کر میں نے آہستہ سے دروازہ کھولا تاکہ اگر وہ پڑھ رہی ہو تو اس کی پڑھائی میں خلل پیدا نہ ہو اور اگر سو رہی ہو تو جاگ نہ جائے۔ میں نے دیکھا کہ زینب پڑھائی میں مشغول تھی۔

میری طرف اس کی پشت تھی۔ میں اس کے بستر کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ ابھی تک اسے میری موجودگی کا احساس نہیں ہوا تھا۔ میں انتظار کر رہی تھی کہ وہ کب پڑھائی سے فارغ ہو کر میری طرف متوجہ ہو، دوسری طرف مجھے اس بات کی بھی خوشی تھی کہ میری بیٹی اتنی لگن سے پڑھتی ہے کہ اسے ارد گرد کی چیزوں کا خیال ہی نہیں رہتا۔ ایک بات کا مجھے ہمیشہ احساس رہا ہے کہ بچوں کے سامنے کوئی نہ کوئی منزل ضرور ہونی چاہیے، جس کو سامنے رکھ کر وہ زیادہ لگن سے کام کریں۔ میں اپنی بیٹی سے پوچھنا چاہتی تھی کہ اس کے سامنے کیا مقصد ہے، جس کے باعث وہ یوں محنت کر رہی ہے۔ میں جانے کتنی دیر کھڑی رہی۔ آخر میرا انتظار ختم ہوا۔ وہ کتاب بیگ میں ڈالنے کے لیے پیچھے مڑی تو مجھے دیکھ کر چونک پڑی!

"امی! آپ یہاں؟"

"کیوں میں اپنے بیٹی کے کمرے میں نہیں آسکتی؟"

"کیوں نہیں امی! یہ آپ ہی کا تو کمرہ ہے۔"

"بیٹی! تم سے ایک بات پوچھنی تھی۔"

"ہاں امی! ضرور پوچھیں۔" اس نے مؤدّب لہجے میں کہا۔

"تمہیں اتنی لگن سے پڑھتا دیکھ کر بہت خوشی ہوئی، مگر یہ بتاؤ کہ تم بڑے ہو کر کیا بننا چاہتی ہو؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

زینب نے سوچتے ہوئے کہا: "پتا نہیں۔"

"واقعی تمہیں نہیں پتا، کیا تمہاری کوئی خواہش نہیں کہ تم ڈاکٹر انجینئر یا استاد بنو گی۔۔۔؟"

"امی میں نے ابھی اس بارے میں سوچا ہی نہیں۔"

"اچھا تو سوچ لو! میں کل اس وقت تم سے دوبارہ پوچھوں گی۔" میں اسے شب بخیر کہہ کر اپنے کمرے کی طرف چل پڑی۔ مجھے افسوس سا ہوا کہ آج تک میں بیٹی کو کچھ نہ بتا سکی کہ اس نے کیا بننا ہے۔ بہر حال! اب مجھے جلد از جلد اس کی سمت متعین کرنی تھی۔

"ہاں بھئی! تم نے مستقبل میں کیا بننے کا سوچا ہے؟" میں نے اگلے روز زینب سے دوستانہ لہجے میں پوچھا۔

"امی! میں ڈاکٹر بننا چاہتی ہوں۔ نہیں پائلٹ نہیں، نہیں استاد۔۔۔"

"لگتا ہے کہ تم نے اتنا سوچا ہے کہ تم الجھ گئی ہو؟" میں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"ہاں جی۔"

"بیٹا، دیکھو! تم ایک ارادہ کر لو کہ تم نے یہ بننا ہے، یوں تم اس ارادے اور منزل کو پانے کے لیے محنت کرو گی اور جب انسان کو اس کی منزل کا پتا چل جاتا ہے تو ترقی کی راہیں کھلتی جاتی ہیں اور وہ منزل پر پہنچ کر ہی دم لیتا ہے۔" زینب میری باتوں کو بڑے غور سے سن رہی تھی، میں نے بات جاری رکھی۔

"میں آج تمہیں اپنی قوم کے لیڈر قائدِ اعظم محمد علی جناح کے بارے میں بتاتی ہوں۔ قائدِ اعظم ہمارے عظیم رہنما ہیں، جنہوں نے بچپن میں ایک بار کسی وکیل کو سیاہ کوٹ پہنے دیکھ کر کہا تھا کہ "میں بیرسٹر بنوں گا۔" انھوں نے محنت کی اور آخر کار اپنی منزل پالی اور اپنے منہ سے ادا ہونے والا جملہ پورا کر دکھایا۔ قائدِ اعظم نہ صرف بیرسٹر بنے بلکہ آپ کا شمار اعلیٰ درجے کے وکیلوں میں ہوتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ قسمت انھیں سیاست کی طرف لے آئی اور پھر جب انھوں نے پاکستان کو دنیا کے نقشے پر ابھارنے کا ارادہ کیا تو انھوں نے اسے بھی سچ کر دِکھایا۔"

"بالکل اسی طرح تم ایک منزل بناؤ اور اس منزل کو پانے کے لیے دن رات ایک کر دو۔ اچھا اب تم سو جاؤ میں کل تم سے دوبارہ پوچھوں گی کہ تم مستقبل میں کیا بننا چاہتی ہو۔" اس کے بعد میں نے زینب کو شب بخیر کہا اور اپنے کمرے کی جانب چل دی۔

"آج تو مجھے یقین ہے کہ میری بیٹی مجھے بتائے گی کہ وہ مستقبل میں کیا بنے گی؟"

میں نے اگلے روز پوچھا۔ "جی امی! میں نے سوچ لیا ہے کہ میں نے کیا بننا ہے۔"

"ہاں تو پھر جلدی بتاؤ۔"

"امی! میں فاطمہ جناح بنوں گی۔ ایک وہ قائدِ اعظم محمد علی جناح تھے، جنہوں نے ہمیں یہ پیارا وطن پاکستان دیا۔ تو میں فاطمہ جناح بنوں گی جو اس ملک کو ترقی کی راہ پر لے جائے گی، ایسی ترقی جو کبھی نہ رکے۔"

وہ کہتی جا رہی تھی اور میں اس کے جذبے کو سلام پیش کر رہی تھی اور دعا کر رہی تھی کہ "اے اللہ! میرے وطن کے ہر بچے میں یہی جذبہ پیدا کر، آمین! تاکہ وہ اس ملک کی تعمیر و ترقی میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔"

آؤ بچو ہم مل کر اک دیس نیا تعمیر کریں!

خرم فاروق ضیا

آؤ بچو ہم مل کر اک دیس نیا تعمیر کریں!
خواب تھا جو قائد کا اسے شرمندۂ تعبیر کریں!

صاحبِ مسند لوٹ کے کھا گئے پیارے پاکستان کو
منصف نے بھی رشوت لے کر بیچ دیا ایمان کو
اللہ کو ناراض کیا اور خوش رکھا شیطان کو
لازم ہے کہ ہم سب مل کر روکیں اس بحران کو
باتوں کا یہ وقت نہیں ہے، اب کوئی تدبیر کریں!
خواب تھا جو قائد کا اسے شرمندۂ تعبیر کریں!

جھوٹ، دغابازی اور بے ایمانی سے ہے پیار ہمیں
بالکل بھی اچھا نہیں لگتا حق سچ کا اظہار ہمیں
فیشن سب منظور مگر، ہے سنت سے انکار ہمیں
یہ سب چھوڑ کے اب بننا ہے ملت کا معمار ہمیں
جرم و گناہ سے رک جائیں! مت نیکی میں تاخیر کریں!
خواب تھا جو قائد کا اسے شرمندۂ تعبیر کریں!

چھوڑ کے بدخواہی کا رستہ، راہِ وفا کو اپنائیں
بھائی چارہ قائم کر کے امن کا پرچم لہرائیں
اپنے گلی محلوں میں مت کوڑا کرکٹ پھیلائیں
اپنا من بھی اجلا رکھیں، اپنا دیس بھی چمکائیں
پاک وطن کے نام کو دنیا میں روشن، تنویر کریں!
خواب تھا جو قائد کا اسے شرمندۂ تعبیر کریں!

بچوں کے فن پارے

صالحہ احتشام 16 سال ،جلال پور جٹاں

اسما کنول 14 سال لاہور

محمد بن عدیل 11 سال حیدر آباد

عفرا حسان 9سال کراچی

محمد ہادی 12 سال کراچی

محمد مصطفی راول پنڈی

مروی عبد الرقیب 9 سال راول پنڈی

مستبشرہ 12 سال لاہور

ہر ماہ ایک فن پارے پر300 روپے انعام دیا جاتا ہے گزشتہ ماہ کراچی سے عفرا حسن کا فن پارہ انعامی قرار پایا ہے، انہیں 300 روپے مبارک ہوں (ادارہ)

چھوٹی بات کا بڑا پیغام

پاک وطن سے محبت کیسے کریں؟

14 اگست آتا ہے تو ہم سب جھنڈیاں لگاتے ہیں، پرچم لہراتے ہیں، اور نعرے لگاتے ہیں: پاکستان زندہ باد! یہ سب دل کو بہت اچھا لگتا ہے، لیکن کیا صرف نعرے لگانا ہی وطن سے محبت ہے؟ نہیں! وطن سے سچی محبت الفاظ سے نہیں، عمل سے نظر آتی ہے۔

- اسکول کا ہوم ورک وقت پر کرنا — کیونکہ علم سے ہی پاکستان کا نام روشن ہوگا۔
- جھوٹ نہ بولنا — تاکہ ہمارا ملک ایماندار لوگوں کا ملک کہلائے۔
- کچرا کوڑے دان میں ڈالنا — کیونکہ صاف پاکستان، خوبصورت پاکستان ہوتا ہے۔
- دوسروں کی مدد کرنا — یہی بھائی چارہ پاکستان کو مضبوط بناتا ہے۔

اور سب سے اہم بات: پاکستان کا مطلب کیا؟ لاالہ الااللہ

اس کو سمجھنا، دل سے ماننا، اور اس کے مطابق عمل کرنا، تاکہ پاکستان کی بنیاد مضبوط اور عمارت مستحکم رہے۔

اگر ہم صرف 14 اگست کو جوش دکھائیں اور باقی دن بھول جائیں، تو یہ محبت ادھوری ہے۔

سچی محبت وہی ہے جو روزمرہ کے کاموں میں جھلکے۔

یاد رکھیں! پاک وطن ہمارا گھر ہے اور اس کا خیال رکھنا ہم سب پہ لازم ہے۔

جولائی 2025ء کی سوالات کا درست جواب دینے پر جلال پور جٹاں سے صالحہ احتشام کو شاباش انہیں 300 روپے مبارک ہوں

ماہنامہ فہم دین اگست 2025ء کے سوالات

سوال 1: خلیل اللہ کس کا لقب ہے؟

سوال 2: صبیحہ اور بریرہ کون سی جماعت کی طالبات تھیں؟

سوال 3: اٹل کے معنی کیا ہیں؟

سوال 4: تقی اور نومی نے کون سے جانور پال رکھے تھے؟

سوال 5: کومل کو کون سی بیماری تھی؟

یہ سوالات جولائی 2025 کے فہم دین سے لیے گئے ہیں۔

جوابات کی آخری تاریخ 15 اگست 2025ء ہے

جولائی 2025ء کے سوالات کے جوابات

1-: دل مچلنا/کھانے کو جی چاہنا

2-جنک فوڈ کی سب ٹوکریاں غائب ہو گئیں

3-اپنے جذبہ جہاد کی وجہ سے

4-پاکستان کے دل پر گھونسا مارنا

5-پریشانی یا بے آرامی

بلاعنوان کا عنوان

جون 2025ء کے ماہ نامہ فہم دین میں ندا اختر کی بلاعنوان کہانی شائع ہوئی تھی، اس کہانی کو عنوان دینے کی مہم میں متعدد قارئین نے حصہ لیا گوجرہ سے خورشید بیگم کا عنوان بہترین قرار پایا، انھیں انعام مبارک ہو، ان کا عنوان تھا: انوکھا ملاپ

اس کے علاوہ کراچی سے اسما انجم، اسلام آباد سے فاطمہ، راجن پور سے عالیہ اکبر اور لاہور سے ہانیہ عبدالشکور نے بھی اچھا عنوان دیا

سنیے!!!!

انعامی سوالات کے جوابات بھیجنا ہوں یا فن پارہ، اپنا نام، عمر، کلاس اسکول/مدرسے کا نام اور رابطے کے لیے موبائل نمبر ضرور لکھیں۔ جوابات اور فن پارہ بھیجنے کے لیے ای میل اور وٹس ایپ نمبر نوٹ کر لیں:

tabeer1387@gmail.com

+923351135011

شہیدوں پہ رحمت ہو تیری سدا

حافظ وسطیٰ چودھری

نقش دل پر ہے میرے، عجب داستاں
درد ہی درد ہے، کرب کا ہے بیاں

وہ مناظر، وہ دن بھول پاتے نہیں
اور وہ لمحے نگاہوں سے جاتے نہیں

مسلمانوں کے تیّار تھے قافلے
چھپ چھپاتے وہ پھر ایک جا آ ملے

جوش و جذبے سے سب ہی وہ سرشار تھے
پاک دھرتی کی ہجرت کو تیار تھے

چاہتے تھے الگ ان کی پہچان ہو
ہو علیحدہ وطن اور جداشان ہو

چل پڑے تھے وہ سب دل میں ایماں لیے
حوصلہ اور ہتھیلی پہ تھے جاں لیے

گھات دشمن تھے، اُن پر لگائے ہوئے
چاقو، تلوار، نیزے اٹھائے ہوئے

ہندوؤں نے بہت ظلم اُن پر کیا
ساتھ بلوائیوں نے بھی اُن کا دیا

بے گناہوں کا پھر خوں بہایا گیا
قافلوں کا تھا گھیرا، جلایا گیا

قتل و غارت کا یوں گرم بازار تھا
خوف ہی خوف تھا، ظلم و آزار تھا

موت ہر سمت دیتی جہاں تھی صدا
حملہ ان پر ہوا، دھوکا ان کو ملا

جسم زخمی تھے اور چوٹ کھائے ہوئے
باپ بچے کا لاشہ اٹھائے ہوئے

کاٹ ڈالا گیا، کوئی بیٹا جواں
اور بلکتی رہی بے بسی سے تھی ماں

چیختی رہ گئیں، بیٹیاں باحیا
چھن گئی تھی سروں سے بھی ان کے ردا

ہر قدم پر نئی، لاش اک تھی پڑی
کس قیامت کے لمحے تھے، کیسی گھڑی

خون سے تر بتر ہو گئی تھی زمیں
بھوک تھی، دھوپ تھی، اور نہ سایہ کہیں

کوئی زادِ سفر تھا، نہ پانی ہی تھا
بستیاں جل گئیں، خاک سب ہو گیا

خونی رشتے جدائیوں تھے ہونے لگے
لوگ پیاروں کو اپنے تھے کھونے لگے

اک ہی آنگن میں کھیلے، رہے ساتھ جو
چھوٹ پھر تھے گئے، ہاتھ سے ہاتھ وہ

جو محافظ تھے بہنوں کے مارے گئے
نیزے اُن کے بدن میں اتارے گئے

رستے دشوار تھے، حوصلہ کم نہ تھا
نعرہ تکبیر سے گونجتی تھی فضا

ہر قدم پر تھا بڑھتا ہی ان کا یقیں
پاک دھرتی کو دیکھیں گے وہ بالیقیں

جاں کے نذرانے، ہر دم لٹاتے ہوئے
دل میں چاہت وطن کی، بساتے ہوئے

پھر وہ لمحہ بھی آیا کہ آنکھیں تھیں نم
پاک مٹی کو چھوتے تھے اُن کے قدم

کتنے لوگوں نے قربان، جاں اپنی کی
اُن جیالوں کے مقروض ہیں ہم سبھی

اُن کے حق میں ہے وسطیٰ کی یارب دعا
اُن شہیدوں پہ رحمت ہو تیری سدا

تو ہے میرا سکوں، تو ہے میرا جہاں

حافظہ سویرا چودھری

ہے محبت تری، میرے خوں میں رواں
تو ہے جذبات اور چاہتوں کی زباں
تو ہے میرا سکوں، تو ہے میرا جہاں
تو ہی میرا سخن، تو مری داستاں

تو ہے رنگوں، گلوں سے مہکتا چمن
چاند، سورج، ستاروں کا دلکش وطن
تو ہے رب کی عطا، ایک تحفہ حسیں
تو ہے سرسبز، سونا اُگلتی زمیں
تو ہے پربت کی چوٹی سے آتی ہوا
تو ہے ساون کی رم جھم، معطّر فضا
جھیل، دریا میں بہتا ترانہ ہے تو
دھوپ، بارش سے نکلا خزانہ ہے تو
مجھ کو محبوب ہیں تیرے کوہ و دمن
تیری آب و ہوا بھی، ہے رشکِ زمن

ہے محبت تری، میرے خوں میں رواں
تو ہے جذبات اور چاہتوں کی زباں
تو ہے میرا سکوں، تو ہے میرا جہاں
تو ہی میرا سخن، تو مری داستاں

تو ہے کاتب، مصور، ادیبوں کا گھر
تو ہے علم اور دانش، ہنر کا نگر
تو ہے مشرق میں، روشن سا جلتا دیا
تیرے فن نے ہے مغرب کو حیراں کیا
تو ہے مزدور کی محنتوں کا ثمر
تو ہے ملت کا نغمہ، وفا کا شجر
نوجواں ہیں جو تیرے وہ شمشیر ہیں
دشمنوں کی وہ گردن کی زنجیر ہیں
تو ہے حق کا نشاں، تو ہے عزمِ جواں
تیرے شیروں سا جذبہ کسی میں کہاں؟

ہے محبت تری، میرے خوں میں رواں
تو ہے جذبات اور چاہتوں کی زباں
تو ہے میرا سکوں، تو ہے میرا جہاں
تو ہی میرا سخن، تو مری داستاں

تیرا چہرہ سنہرا ہے شاداب ہے
تیری دھرتی کا ہر ذرّہ نایاب ہے
تیری مٹی کا مجھ پر یہ احسان ہے
تیرے دم سے ملی مجھ کو پہچان ہے
تو ہے خوشبو کسی پھول کی جاں فزا
تجھ پہ ٹھہریں بہاریں، نہ آئے خزاں
تو رہے جاوداں، تیرے حق میں دعا
تیرا پرچم یونہی لہلہائے سدا
تجھ سے عشق و محبت ہے تو محترم
تجھ پہ رب کا سویرا رہے گا کرم

ہے محبت تری، میرے خوں میں رواں
تو ہے جذبات اور چاہتوں کی زباں
تو ہے میرا سکوں، تو ہے میرا جہاں
تو ہی میرا سخن، تو مری داستاں

گلدستہ

ترتیب و پیشکش: محمد عادل فاروقی

حمدِ باری تعالیٰ

میرے لب پہ ورد ہے لاالٰہ — یہی ورد ہے جو عظیم ہے
تو غفور ہے تو رحیم ہے — تری رحمتوں کی حد ہی نہیں
تیری کائنات کے درمیاں — میں تھا ایک نقطۂ ناتمام
مرے مہرباں! ترا شکریہ — مجھے دے کے وصفِ الٰہیہ
تو نے کیا سے کیا ہے بنا دیا — تو نے بندگی مجھے کی عطا
مری بندگی بڑی بات ہے — یہ تو عکس ہے تری ذات کا
تری ذات سے مری ذات ہے — ترے در پہ سر بہ سجود ہوں
مجھے آگہی سے نواز دے — مجھے رنگ فقر و نیاز دے

شاعر: منیر احمد جامیؔ

نظریۂ پاکستان

نظریۂ پاکستان، نظریۂ اسلام اور نظامِ اسلام کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ نظریۂ پاکستان اوّل روز سے پاکستان کے ساتھ وابستہ ہے۔ پاکستان کا تصوّر پیش کرتے وقت علامہ اقبال رحمہ اللہ نے فرمایا تھا۔

ایک ایسا خطہ زمین درکار ہے، جہاں اسلامی اقدار حیات کو انفرادی تشکیل سیرت اور اجتماعی کردار سازی کا پورا موقع حاصل ہو؟ پاکستان کے مطالبہ کے زمانہ میں جو بات بار بار کہی جاتی تھی، وہ یہ تھی کہ اسلامی تہذیب اور ثقافت کے تحفّظ کے لیے پاکستان درکار ہے۔1946 کے تاریخی انتخابات میں تو ہر شخص کی زبان پر یہ نعرہ تھا کہ پاکستان کا مطلب کیا: لاالہ الااللہ محمد رّسول اللہ! پاکستان بن جانے کے بعد پہلے وزیراعظم لیاقت علی خاں نے امریکہ کا دورہ کیا تھا۔ وہاں انھوں نے امریکی کانگریس کو خطاب کیا تھا۔ وہاں اُنھوں نے کہا تھا کہ ”پاکستان کا قیام اسلام کے لیے ایک لیبارٹری (دارالعمل) ثابت ہوگا۔“ پاکستان کے پہلے وزیراعظم کا یہ پہلا ذمہ دارانہ بیان تھا، جس میں امریکہ کے اندر پاکستان کا تعارف اسلام کے حوالہ سے کرایا گیا تھا۔

(تحریکِ نظریہ پاکستان، پروفیسر محمد سلیم، ص:27)

نعتِ رسولِ مقبول ﷺ

نغماتِ ازل بیدار ہوئے پھر ربطِ دل کے تاروں میں
تکبیر کی آوازیں گونجیں یثرب کے حسیں کہساروں میں

اے رشکِ مسیحا، فخرِ زماں، تو ہی ہے علاجِ دردِ نہاں
مجھ کو بھی پلا دارُوئے شفا، میں بھی ہوں ترے بیماروں میں

اُس شانِ کرم کا کیا کہیے... دنیا کو مسخر جس نے کیا
یہ وصف کہاں شمشیروں میں، یہ بات کہاں تلواروں میں

مستانہ ہواؤں کے جھونکے، نذرانہ عقیدت کا لائے
شبنم کے گہر تقسیم ہوئے، کچھ پھولوں میں کچھ خاروں میں

پھولوں کی زباں پر ذکر ترا، غنچوں کے لبوں پر مدح تری
اے حسنِ ازل کے شیدائی، چرچا ہے ترا مہ پاروں میں

مومن کی نگاہوں میں فطرتؔ، کہسارِ عرب ہے رشکِ جناں
پھولوں کا تبسّم رقصاں ہے... فردوس بداماں خاروں میں

شاعر: ڈاکٹر محمد حسین فطرتؔ

مومن کی شان

علی بن حسین بن علی بن ابی طالب رحمہ اللہ کا ایک لڑکا فوت ہوگیا۔ علی بن حسین بیٹے کی موت پر غم زدہ ہوئے اور نہ ہی جزع فزع کیا۔ ایک آدمی نے علی بن حسین سے کہا:

”اے علی! آپ کا صاحبزادہ، جگر کا ٹکڑا، دنیا میں آپ کا وارث اور آپ کا مضبوط ہاتھ آپ کو چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلا گیا اور آپ ہیں کہ اس حادثہ پر نہ تو جزع فزع کیا اور نہ ہی آپ پر اس کا کوئی خاص اثر ہوا؟؟؟“

علی بن حسین نے جواب دیا: ”ہاں! یہ ایسا حادثہ ہے، جس کو ہم یقینی سمجھتے تھے۔ اب اگر وہ واقع ہوگیا تو ہمیں اظہارِ افسوس کرنے کی کیا ضرورت! اللہ کی قضا کے آگے تسلیم خم کردینا ہی مومن کی شان ہے۔“

(سنہرے اوراق، عبدالمالک مجاہد، ص:315)

سب سے زیادہ نافع ادب

کسی نے حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے پوچھا: ”سب سے زیادہ نفع دینے والا ادب کون سا ہے؟“

فرمایا: ”دین کی سمجھ حاصل کرنا اور دنیا سے بے رغبتی کرنا یہی دین کی ساری فہم ہے اور یہ کہ اللہ کی رضا معلوم کرے، اس کی ناپسند باتوں سے بچے، قرآن و حدیث سب کا خلاصہ یہی ہے کہ دین کی سمجھ مل جائے۔“

(مجالسِ مفتیِ اعظم، مالانا عبدالرؤف سکھروی، ص:502)

اشعار

وطن کی ریت ذرا ایڑیاں رگڑنے دے
مجھے یقیں ہے کہ پانی یہیں سے نکلے گا
مظفر وارثی

وطن کی خاک سے مر کر بھی ہم کو انس باقی ہے
مزا دامانِ مادر کا ہے اس مٹی کے دامن میں
چکبستؔ

اے اہلِ وطن شام و سحر جاگتے رہنا
اغیار ہیں آمادۂ شر جاگتے رہنا
جعفر بلوچؔ آبادی

اے ارضِ لوح و قلم، اے ادب گہِ شبنم
ترے لئے میں سدا فکرِ شعرِ تر میں رہوں
شبنم شکیل

کہیں امید کی کرنیں دلوں میں روشنی کر دیں
کئی جذبے بہت نایاب ہیں وہ سب وطن کے ہیں
صبیحہ صبا

انتخابِ آرزو ہیں فتح و نصرت کے چراغ
ہیں فروزاں خونِ دل سے ملک و ملت کے چراغ
(ساغرؔ صدیقی)

جس کے دانتوں میں مری قوم کے ریشے ہیں ابھی
وہی سفاک مرے دیس کا ہمدم کیوں ہو
احمد ندیم قاسمیؔ

متحد ہو کر جئیں، تو ایک طاقت ہم بھی ہیں
گر سلامت یہ وطن ہے، تو سلامت ہم بھی ہیں
صہبا اخترؔ

چنگیز خان اور سکندر اعظم کی قبریں کہاں ہیں؟

تاریخِ اسلام میں ہے، جب چنگیز خاں کا انتقال ہونے لگا تو اس نے اپنے ساتھیوں سے یہ وصیت کی کہ جب میں مر جاؤں تو فلاں درخت کے نیچے مجھے دفنا دینا۔ انتقال ہوا درخت کے نیچے دفنایا گیا۔ اتفاق سے دوسرے روز بارش شروع ہوئی اور چھ ماہ تک بارش ہوتی رہی، وہ جگہ جنگل میں تبدیل ہو گئی اور وہ درخت اس جنگل میں مل گیا۔ لوگوں کو پتا نہ رہا کہ چنگیز خان کو کس درخت کے نیچے دفنایا گیا تھا۔ وہ ظالم قوم جنہوں نے بیک وقت بیس بیس لاکھ انسانوں کو قتل کیا جو گھوڑے کی پشت سے تین تین روز تک اترتے نہیں تھے، پیاس لگتی تو گھوڑے کی پشت پر خنجر مارتے، کٹورا ساتھ ہوتا کٹورے کو خون سے بھرتے اور اسے پی جاتے، یہ ان کا پانی تھا۔ آج ان کے سردار کی قبر کا ٹھکانہ نہیں۔

خطباتِ حکیم الاسلام میں مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ سکندرِ اعظم کی قبر عراق کے بابل کے کھنڈرات میں ہے، لیکن قبرستان میں کوئی صحیح قبر نہیں بتا سکتا۔ جب کوئی سیّاح سیر کو یا تفریح کو جاتا ہے تو وہاں کے گائیڈ کچھ قبروں کی طرف اشارہ کر کے بتاتے ہیں کہ انھیں قبروں میں ایک قبر سکندرِ اعظم کی ہے۔

فائدہ: جس انسان نے دنیا فتح کی، آج اس کی قبر کی نشاندہی مشکل ہے۔ اس لیے انسان اپنے ایمان اور اعمال بنانے کی فکر کرے اور اللہ کی بارگاہ میں اتنا مقبول ہو جائے کہ لوگ اس کے لیے دعا کریں۔

(انمول موتی، ص:418)

عدلِ فاروقی کا واقعہ!

"الاستقصاء الاخبار دول العرب الدفعی" کے مصنف نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ جبلہ بن ایھم نامی ایک غسان کا بادشاہ مدینہ میں اپنے پانچ سو سواروں کے پروٹوکول کے ساتھ قبولِ اسلام کے لیے حاضر ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں اسلام کے بنیادی ارکان سکھائے اور انھیں داخلِ اسلام کیا، بعد ازاں جبلہ بن ایھم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ حج پر چلا گیا۔ ان دنوں ایامِ حج تھے، دورانِ طواف بیت اللہ اس کے جبے پر ایک بدوی کا پاؤں آ گیا، جو قبیلۂ فزارہ کا ایک فرد تھا۔ اس غسانی بادشاہ جبلہ بن ایھم نے غصے میں اس غریب مسلمان بدوی کے منہ پر تھپڑ دے مارا۔ مسلمان احترامِ حرم میں خاموش رہا اور بعد میں امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے معاملہ عرض کیا تو انھوں نے شاہِ غسان کو طلب کر کے معاملہ کی تفتیش کی تو اس نے اقرار کر لیا کہ میں بادشاہ ہوں اور یہ غریب آدمی ہے، اس نے میرے جبے پر پاؤں رکھا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "تم اس سے معافی مانگ کر اسے راضی کر لو یا پھر اس کے بدلے میں عدالتی کاروائی کے لیے تیار ہو جاؤ۔" وہ بہت حیران ہوا کہ ایک بدو کے بدلے میں مجھے تھپڑ مارا جائے گا، لیکن اس کے منصب کا ظاہری رعب و دبدبہ بھی اسلام کے نظامِ عدل کو متاثر نہ کر سکا اور وہ بجائے اسلامی عدالت کے فیصلے کو ماننے کے مرتد ہو کر واپس بھاگ گیا۔ اسلام نے ایک شخص کے مرتد ہونے کو برداشت کیا، لیکن اپنے نظامِ عدل کا موردِ الزام بننا گوارا نہیں کیا۔

(خطباتِ عزیزی، مفتی رضوان عزیز صاحب، ص:97)

سو جانے اور مو جانے کا فرق

ایک شخص حسن بصری رحمہ اللہ کے پاس حاضر ہوا، کہنے لگا: "حضرت! پتا نہیں ہمارے دل سو گئے ہیں۔"

فرمایا: "وہ کیسے؟" عرض کیا کہ "حضرت! آپ درس دیتے ہیں، وعظ و نصیحت کرتے ہیں، لیکن دل پر اثر نہیں ہوتا۔" حضرت نے فرمایا: "اگر یہ معاملہ ہے تو یہ نہ کہو کہ دل سو گئے، تم یوں کہو کہ دل مو گئے (مر گئے)۔" وہ بڑا حیران ہوا، کہنے لگا: "حضرت! یہ دل مر کیسے گئے؟" حضرت نے فرمایا: دیکھو! جو انسان سویا ہوا ہو، اسے جھنجھوڑا جائے تو وہ جاگ اٹھتا ہے اور جو جھنجھوڑنے سے بھی نہ جاگے، وہ سویا ہوا نہیں وہ مویا ہوا ہوتا ہے، جو انسان اللہ کا کلام سنے، نبی علیہ الصلوٰۃ والسّلام کا فرمان سنے اور پھر دل اثر قبول نہ کرے، یہ دل کی موت کی علامت ہوتی ہے۔ تو ہم اس دل کو مرنے سے پہلے پہلے روحانی اعتبار سے زندہ کر لیں۔

(خطباتِ عزیزی، مفتی رضوان عزیز صاحب، ص:97)

پانی، غذا و خوراک کی فراہمی

ہر ماہ لاکھوں افراد مستفید ہوتے ہیں

رپورٹ: مدثّر شہزاد

معاشرے کے ایسے افراد جو مالی لحاظ سے کمزور ہیں، سفید پوش اور حقیق مستحق ضرورت مند ہیں، شہر کی مضافاتی اور گاؤں گوٹھوں کی دور دراز پس ماندہ بستیوں میں رہتے ہیں۔ الحمد للہ بیت السلام ویلفیئر ٹرسٹ ایسے افراد کی مسلسل اور مستقل خبر گیری اور دیکھ بھال کا اہتمام کرتا ہے۔ یہ خبر گیری خصوصا روزمرہ کی لازمی ضروریات کی فراہمی کی شکل میں ہوتی ہے۔ چناں چہ بیت السلام ویلفیئر ٹرسٹ غذا و خوراک اور فراہمی آب کی شکل میں ہر ماہ لاکھوں افراد کی خبر گیری کرتا اور ان کی خدمت کرتا ہے۔ درج ذیل اشیاء کی فراہمی بیت السلام کا شعبہ غذا و خوراک اور شعبہ فراہمی آب اہتمام کرتے ہیں۔

- پینے کا پانی
- راشن
- آٹا
- پکی پکائی روٹی
- گوشت

بیت السلام فراہمی خوراک کے اس سلسلے کو مزید وسیع کرنے کے لیے کوشاں اور مستحق افراد کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ اہل خیر اس جذبے اور خبر گیری مہم میں بیت السلام سے مستقل معاونت کرتے ہیں۔ اللہ تعالی ان کا جذبہ اور مساعی قبول فرمائے۔ آمین

بیت السلام موبائل ایپ

Available on the App Store

GET IT ON Google Play

- قبلہ ڈائریکشن
- ان فلائٹ نماز ٹائمنگ
- آن لائن ڈونیشن
- زکوۃ کیلکولیٹر
- لائیو اور ریکارڈ بیانات
- روزمرہ کی دعائیں
- قرآن کریم
- نماز ٹائمنگ

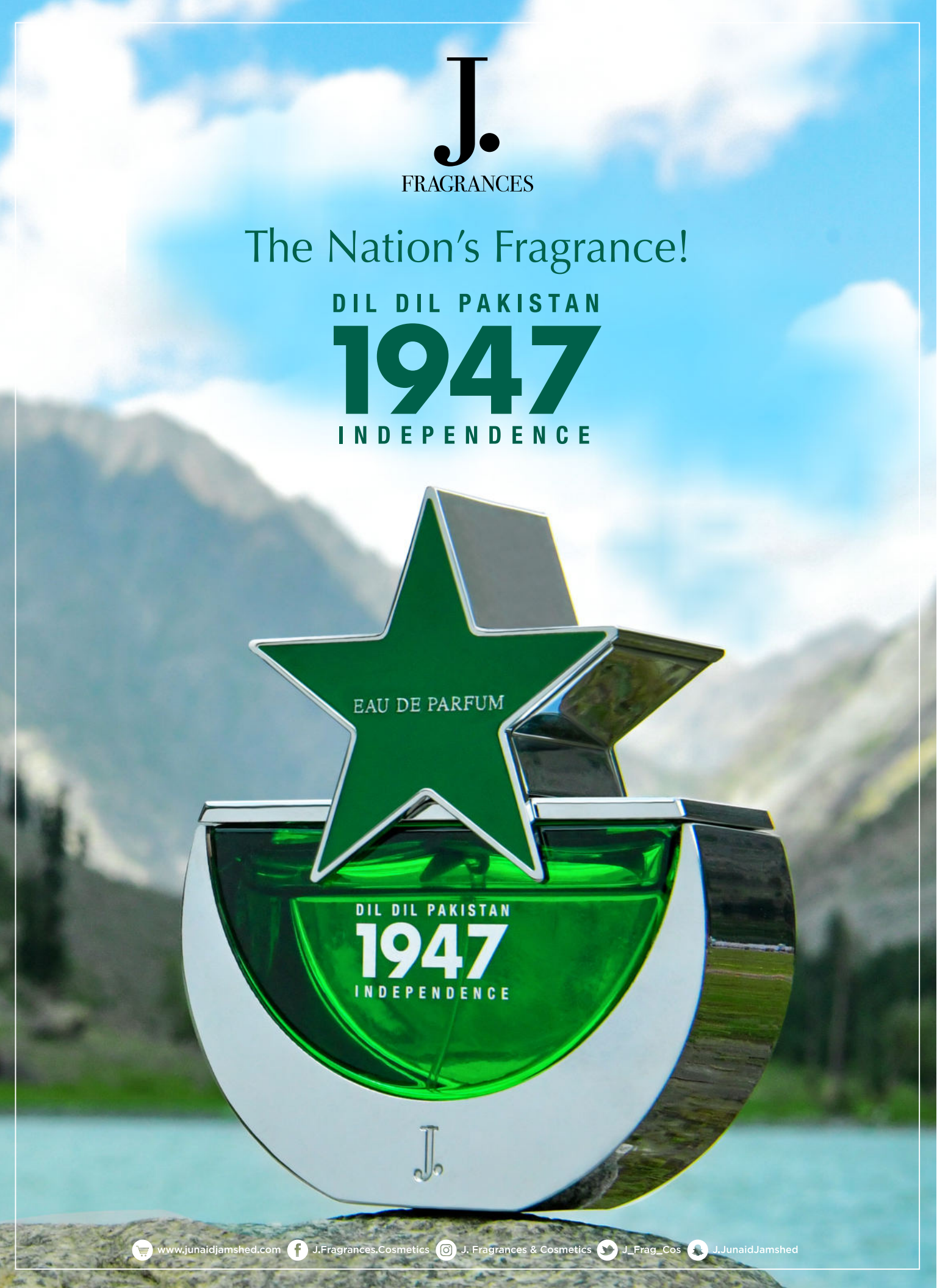

J.
FRAGRANCES
The Nation's Fragrance!
DIL DIL PAKISTAN
1947
INDEPENDENCE
EAU DE PARFUM
DIL DIL PAKISTAN
1947
INDEPENDENCE
J.
www.junaidjamshed.com
J.Fragrances.Cosmetics
J. Fragrances & Cosmetics
J_Frag_Cos
J.JunaidJamshed